رنگیلا پرندہ

(ایک کبوتر کی کہانی)

دھن گوپال مُکرجی

مصوّر

بورس ارتصیٰ باشیف

مترجم

شبابِ لِلت

''رنگیلا پرندہ'' ایک قاصد کبوتر کی تربیت و پرداخت کی دل کو چھو لینے والی کہانی ہے۔ اسے دھن گوپال مکرجی نے ہندوستان میں گزارے اپنے لڑکپن کے ذاتی تجربات و واقعات کے خزانے سے لے کر بُنی ہے۔ رنگیلا کے مالک نے جو ایک علم جُو اور حساس لڑکا ہے کیسے اپنے تربیت یافتہ اور دلیر کبوتر کو بدیش بھیجتا ہے اور وہاں وہ کبوتر کس جواں مردی سے اپنی خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ محض ایک کبوتر کی تربیت اور پُر خطر مہمات کی کہانی ہی نہیں ہے بلکہ ہمت اور محبت کی داستان ہے۔

دھن گوپال مکرجی واحد ہندوستانی ادیب ہیں جنہیں بچوں کے اعلیٰ ترین ادب کے لیے نیو بیری تمغہ عطا کیا گیا۔ وہ 1890 میں کلکتہ کے نزدیک پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسے برہمن خاندان کے بیٹے تھے جسے صدیوں سے کلکتہ کے مضافات میں ایک مندر کے پجاری کا موروثی منصب حاصل تھا۔ وہ انیس برس کی عمر میں امریکہ گئے۔ کیلی فورنیا اور سٹین فوڑد کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ ایک امریکن خاتون سے شادی کی اور اپنی باقی زندگی امریکہ میں تحریر و تقریر کے پیشہ میں گزار دی۔ وہ بھارت کے دھرم اور علم کے ذخیرے کو ساتھ لے گئے اور اپنی تصانیف میں انہوں نے اپنے لڑکپن کی تصویر پیش کی۔ نیز اُس زندگی کی جو انہوں نے اپنے گرد و پیش دیکھی یا دوستی کے وسیلے سے دریافت کی۔ ان کی دوسری تصانیف میں ''کاری نامی ہاتھی'' اور ''جنگلی لڑکا ہری'' شامل ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

نہرو بال پستکالیہ

رنگیلا پرندہ

(ایک کبوتر کی کہانی)

دھن گوپال مکرجی

مصوّر

بورس ارتصئی باشیف

مترجم

شباب للت

nbt.india

एकः सूते सकलम्

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ناشر نے کتاب میں دی گئی تصاویر کے کاپی رائٹ (مالکانہ حقوق) کے وارث کا پتہ لگانے کی ہرممکن کوشش کی ہے تاکہ اس کے استعمال کی اجازت حاصل کی جا سکے لیکن کتاب کا مسودہ پریس میں بھیجنے تک اس میں کامیابی نہیں ملی۔ اگر مصوّر کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم کر سکے تو ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔

پہلی اشاعت: 1927 ناشر ای۔ پی۔ ڈٹن اینڈ کمپنی، اینک ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ISBN 978-81-237-3466-8

پہلا اُردو ایڈیشن: 2001 (ساکا 1923)

دوسری طباعت: 2013 (ساکا 1935)

© برائے اردو ترجمہ: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

Gay-Neck (Urdu)

قیمت: 45.00

ناشر: ڈائریکٹر، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
5، نہرو بھون، انسٹی ٹیوشنل ایریا، II،
وسنت کنج، نئی دہلی۔ 110070
Website: www.nbtindia.gov.in

فہرست

پیش لفظ

بہت کم ہندوستانیوں نے اس غیر معمولی مصنف دَھن گوپال مُکر جی کا نام سُنا ہوگا یا اُن کی اس ممتاز تصنیف ''رنگیلا پرندہ'' کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اس کتاب کو 1928 میں 'نیو بری تمغے' سے نوازا گیا تھا۔ نیو بری تمغہ 'امریکن لائبریری ایسوسی ایشن' کی جانب سے ہر برس بچّوں کے ادب میں گراں قدر خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔ گزشتہ 75 برسوں میں یہ اعزاز پانے والے شری مُکر جی پہلے ہندوستانی ہیں۔

ہندوستان میں ہر برس بچّوں کے لیے ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں بیشتر علمیّت کی نمائش کرنے والی، اخلاقی نصیحتیں اور اپدیش سے بھری ہوتی ہیں۔ وہ بچّوں کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حالانکہ ہمارا دیش قدرتی طور پر ہر طرح سے مالا مال ہے۔ جنگل میں رہنے والے جانور، رنگ برنگ کی چڑیا، مختلف طرح کے پیڑ پودے دنیا بھر کی چیزیں ہیں لیکن ان موضوعات پر بہت کم ہی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہندوستان کے پرندوں پر سیر حاصل جانکاری کرنے والی کچھ کتابیں دستیاب ہیں لیکن ان میں دلچسپی کی بے حد کمی ہے۔ کسی پرندے کی شناخت کرنے سے زیادہ بچّوں کو اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کی قربت کو محسوس کر سکے۔ ''رنگیلا پرندہ'' اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ اس میں سائنسی حقائق کو کہانی کے تانے بانے میں پیش کیا گیا ہے۔ حقائق اور افسانہ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ یہی بات اس کتاب کو اہم بناتی ہے۔ ''رنگیلا پرندہ'' کو دوبارہ شائع ہونے میں ساٹھ برسوں کا وقت لگا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ بھارت میں بچّوں کے ادب کی حالت سچ مچ افسوسناک ہے۔ ہندوستان کے مشہور نیچرلسٹ

ادیب ایڈورڈ ہیملٹن ایٹکن ہیں جو ''ای۔ایچ۔اے'' کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔اُن کی کلاسیکی تصانیف ''ایک نیچورلسٹ شکار کی گھات میں'' اور ''بھارت کے عام پرندے'' پچھلے پچاس سال سے دوبارہ شائع نہیں ہوسکیں۔

حالانکہ ''رنگیلا پرندہ'' خصوصی طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔تاہم اس میدان میں کام کرنے والے کے لیے مفید ہوگی۔اس میں ایک کبوتر کے بارے میں بے حد دلچسپ اور ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ہمالیہ کے اردگرد پائے جانے والے نباتات کے بارے میں بھی ضروری جانکاری فراہم کی گئی ہے۔یہ کلکتہ کے ایک پالتو کبوتر اور ایک حسّاس نوجوان کی دلچسپ کہانی ہے۔اس کبوتر کو پیغام رسانی کی تربیت دی گئی ہے۔اسے ہمالیائی خطّے میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہ گُم ہو جاتا ہے اور بہت سے پُرخطر کارنامے انجام دیتا ہے۔پہلی عالمی جنگ کے دوران فرانس میں لڑنے والی ہندوستانی افواج نے خفیہ پیغامات بھجوانے کے لیے کبوتروں سے قاصد کا کام لیا تھا۔

دَھن گوپال مُکر جی (1890-1936) کلکتہ کے نواح میں پیدا ہوئے تھے۔وہ مندر کے پجاریوں کے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔انیس برس کی عمر میں وہ امریکہ پہنچے اور کیلیفورنیا اور سٹین فورڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔وہاں انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کرلی اور اپنی باقی زندگی امریکہ میں تصنیف وتالیف میں گزاردی۔انہوں نے بچوں کے لیے جانوروں کی کہانیوں پر مشتمل نو کتابیں لکھیں جن میں ''گجراج (ہاتھی) کاری'' (مطبوعہ 1922)، ''جنگلی لڑکا ہری'' (1929) اور ''شکاری گھونڈ'' (1928) بھی شامل ہیں۔لیکن وہ اپنی جڑوں کو نہیں بھولے اور انہوں نے ہندوستان کے دھرم اور علم و ہنر کے بارے میں گہری ذہانت سے لکھا۔ ''رنگیلا پرندہ'' صحیح معنوں میں ایک قاصد کبوتر ہے جو تمام عالمِ انسانیت تک محبت، حوصلہ مندی اور اَمن کا پیغام پہنچاتا ہے۔

نئی دہلی — اروِند گپتا

اپریل 1998

رنگیلا کا جنم

کلکتہ شہر جہاں کی آبادی دس لاکھ ہے وہاں کم از کم بیس لاکھ کبوتر ضرور ہوں گے۔ہر تیسرے ہندو لڑکے کے پاس غالباً ایک درجن پالتو قاصد کبوتر ٹمبوٓلر، فین ٹیٓل اور پاوٗٹر ہیں۔ہندوستان میں کبوتروں کو پالتو بنانے کا ہنر ہزاروں سال پرانا ہے۔کبوتروں کی دو نسلیں فین ٹیٓل اور پاوٗٹر دنیا کو بھارت کے کبوتر پالنے والوں کی خصوصی دین ہیں۔صدیوں سے کبوتروں کو محبت اور لاڈ حاصل رہا ہے۔ شہنشاہ، شہزادے اور بیگمات اپنے سنگِ مرمر کے محلوں میں اور غریب لوگ اپنے گھروں میں ان پر لاڈ نچھاور کرتے رہے ہیں۔ہندوستانی امرا کے باغات، گپھاؤں اور چشموں کی اور عام لوگوں کے پھولوں اور پھلوں سے بھرے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی آرائش اور نغمگی کا سامان اور یاقوتی سرخ آنکھوں والی فاختائیں۔

آج بھی جو غیر ملکی ہمارے بڑے شہروں میں سیاحت کے لیے آتے ہیں وہ چھتوں پر ان گنت لڑکوں کو سفید جھنڈیاں ہلاتے دیکھ سکتے ہیں جو ٹھنڈی ہوا میں اڑتے ہوئے پالتو کبوتروں کو ہدایت دینے کے لیے ہلاتے ہیں۔نیلے آکاش میں یہ پرندے بادلوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ پہلے ایک چھوٹے سے غول میں پرواز کرتے ہیں اور لگ بھگ بیس منٹ تک اپنے مالکوں کی چھتوں کے اوپر چکّر کاٹتے رہتے ہیں۔تب دھیرے دھیرے وہ اوپر کو بڑھتے ہیں اور شہر

کے مختلف مکانوں سے اڑان بھرتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے جھنڈ باہم مل کر ایک بہت بڑا جھنڈ بنا لیتے ہیں اور آسمان میں تیرتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ کبوتروں کے یہ جھنڈ واپس اپنے اپنے گھروں کو کیسے لوٹ آتے ہیں جبکہ گھروں کی چھتیں بالکل ایک جیسی لگتی ہیں۔ ہر چند ان کے گھروں کے رنگ گلابی، زرد، جامنی اور سفید ہوتے ہیں۔

لیکن کبوتروں کو سمت کی حیرت انگیز طور پر پہچان ہوتی ہے اور اپنے مالک سے بے انتہا اُنس بھی۔ میں نے ابھی تک ایسا کوئی جاندار نہیں دیکھا جو کبوتروں اور ہاتھیوں سے زیادہ وفادار ہو۔ میں ان دونوں جانوروں کے ساتھ کھیلا ہوں۔ ہاتھی ہو یا کبوتر، وہ چاہے کتنی ہی دور نکل جائے اپنی اچوک جبلّت کی مدد سے واپس اپنے دوست اور بھائی ـــــ یعنی انسان کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔

میرے دوست ہاتھی جس کا نام کارِی تھا اس کے بارے میں آپ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اور ایک پالتو کبوتر جس کا نام تھا چتر گریوا۔ چتر کے معنی شوخ رنگوں میں رنگی اور گریوا کے معنی ''گردن''۔ اِسے ایک جُملے میں خوش رنگ گردن یا رنگیلی گردن والا کبوتر کہہ سکتے ہیں۔ کئی بار اسے ''اِندردھنشی گلے والا'' بھی کہتے تھے۔

بے شک خوش رنگ گردن والا کبوتر اپنی ماں کے انڈے سے تو رنگ برنگی گردن لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ کئی ہفتوں میں اس کے پَر نکلے۔ جب تک وہ تین ماہ کا ہوا تب تک یہ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی شوخ چمکیلی گردن والا ہوگا۔ آخر کار جب اس نے شوخ گردن پالی تو وہ میرے شہر کا سب سے خوبصورت کبوتر بن گیا حالانکہ میرے شہر میں لڑکوں کے پاس لگ بھگ چالیس ہزار کبوتر تھے۔

لیکن میں اپنی یہ کہانی بالکل شروع ہی سے سناؤں گا۔ میرا مطلب ہے خوش رنگ گردن والے کبوتر کے ماں باپ سے شروع کروں گا۔ اس کا باپ ٹمبلر نسل کا کبوتر تھا اور اس نے اپنے وقت کی حسین ترین کبوتری سے بیاہ رچایا تھا جو پیغام رساں کبوتروں کی ایک قدیمی معزز نسل سے

تعلق رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں خوش رنگ کبوتر بھی زمانۂ جنگ میں اور امن کے دَور میں بھی ایک لائق پیغام رساں ثابت ہوا۔ اُسے اپنی ماں کی جانب سے ذہانت ورثہ میں ملی اور والد کی طرف سے بہادری اور چوکسی۔ وہ اتنا حاضر دماغ تھا کہ کئی مرتبہ وہ عقاب کے پنجوں سے بالکل آخری وقت پر عین دشمن کے سر کے اوپر سے قلابازی لگاتا ہوا نکل بھاگا۔ اور یہ سب اس نے صحیح موقع اور مقام پر کر دکھایا۔

آئیے اب میں آپ کو بتا دوں کہ یہ خوش رنگ کبوتر ابھی اپنی ماں کے انڈے میں ہی تھا تو کیسے بال بال بچا۔ میں اس دن کو ہرگز نہیں بھول سکتا جب میں نے ان دو انڈوں میں سے ایک کو غلطی سے توڑ دیا جو رنگیلا کی ماں نے دے رکھے تھے۔ یہ واقعی میری سخت احمقانہ حرکت تھی۔ مجھے اب بھی اس پر پچھتاوا ہوتا ہے۔ کون جانتا ہے اگر ایسا ہو جاتا تو انڈے کے ٹوٹنے سے دنیا کا ایک نفیس ترین کبوتر لقمۂ اجل بن جاتا۔

بات کچھ ایسے ہوئی کہ چار منزلہ مکان کی چھت پر ہمارا کبوتر خانہ بنا ہوا تھا۔ ماں کبوتری کے انڈے دینے کے کچھ روز بعد میں نے کبوتر خانہ کے اس دروازے کو صاف کرنے کی ٹھانی جس میں رنگیلا کی ماں اپنے انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بڑے آرام سے اٹھایا اور اپنے قریب ہی چھت پر بٹھا دیا۔ پھر میں نے باری باری انڈوں کو احتیاط سے اٹھایا اور انہیں آہستہ سے کبوتر خانہ کے اگلے دروازے میں رکھ دیا۔ البتہ اس دروازے کے چوبی فرش پر کوئی روئی یا فلالین نہیں لگی ہوئی تھی۔ تب میں گھونسلے کی اس جگہ سے کوڑا اٹھانے لگ گیا جہاں انڈے دیئے جاتے تھے۔ جونہی یہ کام ختم ہوا' میں ایک انڈے کو واپس لایا اور اسے اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں دوسرا انڈا لانے گیا اور اسے آہستہ سے لیکن مضبوطی سے تھاما۔ عین اسی وقت میرے چہرے پر کوئی چیز آن گری ایسا لگا کہ جیسے آندھی میں کوئی چھت اڑ کر مجھ پر آن گری ہو۔ اصل میں یہ رنگیلا کا باپ تھا جو غصّے میں میرے چہرے کو اپنے پنکھوں سے پیٹنے لگا تھا۔ برا اور بھی یہ ہوا کہ اس نے ایک پاؤں کا پنجہ میری ناک پر جما دیا۔ اس سے مجھے ایسا درد ہوا اور حیرانی بھی کہ پتہ ہی نہیں

چلا کہ کب وہ انڈا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں اُس پرندے کو اپنے سر اور چہرے سے جھٹک کر ہٹانے میں لگا رہا۔ آخر وہ اڑ گیا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور وہ انڈا بھرتہ بن کر میرے قدموں میں گرا پڑا تھا۔ مجھے اس کے بے ہودہ باپ پر اور اپنے آپ پر بھی بہت غصہ آیا۔ خود پر غصہ کیوں؟ ـــــ جی ہاں، مجھے اس کے باپ کے حملے کے بارے میں پہلے سے تیار رہنا چاہئے تھا۔ اس نے مجھے انڈوں کا چور سمجھ لیا اور لاعلمی میں ہی اپنے گھونسلے کو لٹنے سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان کا خطرہ مول لے لیا۔ آپ بھی یہ سمجھ لیجئے جب کبھی آپ انڈے سینے کے موسم میں کسی پرندے کا گھونسلا صاف کریں تو اس قسم کے اچانک حملوں کی پہلے ہی سے امید رکھیں۔

آگے کی کہانی یوں ہے کہ ماں کبوتری کو اس دن کا پتہ تھا جب اسے اپنی چونچ سے اپنے انڈے کے خول کو توڑ کر رنگیلا کو اس دنیا میں لانا تھا۔ اگر چہ نر کبوتر بھی انڈوں کو سینے کی معیاد کا لگ بھگ تین حصہ انڈوں پر بیٹھتا ہے یعنی وہ روزانہ صبح سے دوپہر بعد تک انڈوں پر بیٹھتا ہے، پھر بھی اسے بچے کی پیدائش کے حتمی وقت کا علم نہیں ہوتا۔ کبوتری ماں کے علاوہ کسی کو بھی اس خدائی امکان کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ وہ کس طرح کا بے تار برقی پیغام ہوتا ہے جس کے ذریعے ماں کبوتری کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اب اس کے انڈے کے خول کے اندر زردی اور سفیدی ایک بچے کا روپ اختیار کر چکی ہے۔ اسے اس صحیح جگہ کا پتہ لگانا بھی آتا ہے جہاں سے انڈے کے چھلکے کو پھوڑنے سے بچہ بغیر ذرا سی چوٹ پہنچے باہر آ جائے گا۔ میں تو اسے ایک معجزہ سمجھتا ہوں۔

رنگیلے کی ولادت بالکل ویسے ہی ہوئی جیسا میں نے بیان کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ماں کبوتری انڈہ دینے کے لگ بھگ بیسویں دن اپنے انڈے پر نہیں بیٹھی تھی۔ جب بھی رنگیلے کا باپ چھت سے اڑ کر نیچے آیا اور اس نے انڈا سینے کی پیشکش کی، ماں کبوتری نے اسے ٹھونگا مار کر دور بھگا دیا۔ تب اس نے غٹرغوں کی جس کا مطلب تھا کہ تم مجھے کیوں دور بھیجتی ہو؟

ماں کبوتری نے اور بھی زیادہ ٹھونگے مار کر اسے دور دھکیلا جس کا مطلب تھا۔ براہِ مہربانی چلے جاؤ۔ جو کام ہاتھ میں ہے وہ بہت نازک ہے۔

تب باپ وہاں سے اڑ کر دور چلا گیا۔ اس سے مجھے تشویش ہوئی چونکہ میں انڈے کے پھوٹنے کا بیتابی سے انتظار کر رہا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ پتہ نہیں انڈا پھوٹے گا بھی یا نہیں۔ میں نے حد درجہ دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ کبوتر کے ڈربے پر نظر جمائے رکھی۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ اگلے ایک گھنٹے کے تیسرے چوتھائی حصے میں جا کر کہیں ماں کبوتری نے اپنا سر ایک جانب جھکایا اور غور سے کچھ آہٹ سنی۔ شاید یہ انڈے کے اندر کی کچھ ہلچل تھی۔ تب اس نے تھوڑا ہلنا شروع کیا۔ ایسا لگا جیسے اس کے تمام جسم میں کپکپی مچ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں بڑی مستعدی آ گئی اور اس نے سر اٹھا کر نشانہ سادھا چونچ کی دو ہی چوٹوں سے اس نے انڈے کو پھوڑ کر کھول دیا۔ اور اس میں سے ایک ننھا پنچھی دکھائی دینے لگا۔ بس ایک چونچ اور، کانپتا ہوا ننھا سا جسم باہر۔ اب ذرا ماں کی طرف دیکھو۔ وہ حیران سی تھی یہ دیکھ کر کہ کیا بس یہی ننھی سی چیز تھی جس کی وہ اتنے لمبے عرصے سے راہ دیکھ رہی تھی۔ کتنی چھوٹی اور بے بس! جونہی اسے اپنے بچے کی بے بسی کا خیال آیا اس نے اسے اپنی چھاتی کے ملائم نیلے پروں کے نیچے چھپا لیا۔
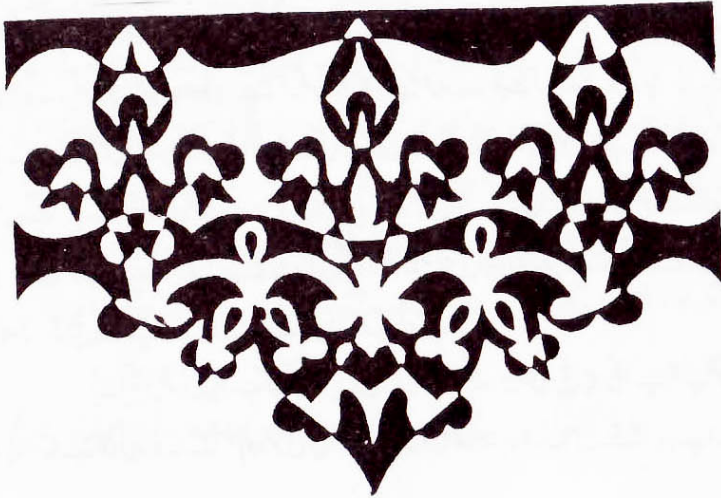
رنگیلے کی تعلیم

پرندوں کی دنیا میں دو بہت خوبصورت نظارے ہوتے ہیں ایک وہ جب مادہ چڑیا اپنے بچے کو پہلی بار دنیا میں لانے کے لیے اپنے انڈے کو پھوڑتی ہے اور دوسرا وہ جب انڈے سیتی ہے اور اپنے بچے کو کھانا کھلاتی ہے۔ رنگیلا جب انڈے میں تھا تو اس کے ماں باپ دونوں انتہائی پیار سے انڈے کو سیتے رہے۔ انڈے سینے کے عمل کا اس پر وہی اثر ہوا جو آدمی کے بچے کو گودی میں لے کر پیار کرنے کا ہوتا ہے۔ اس سے بے بس بچوں کو گرمی اور سکھ ملتا ہے۔ یہ ان کے لیے اتنا ہی لازمی ہوتا ہے جتنا کہ کھانا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبوتروں کے ڈربے میں زیادہ روئی یا فلالین نہیں بچھانی چاہیے۔ یہ تھوڑی بچھائی ہوتی ہے تاکہ گھونسلے کا درجۂ حرارت بہت زیادہ نہ بڑھ جائے۔ کبوتر پالنے والے بعض انجان لوگوں کو اس بات کی سمجھ نہیں ہوتی کہ جوں جوں کبوتر کا بچہ بڑا ہوتا ہے خود اس کے جسم سے نکلنے والی حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ اور میری رائے میں اس دوران گھونسلے میں بار بار صفائی کرنی چاہیے۔ پرندے کے ماں باپ گھونسلے میں جو بھی چیز اس عرصے میں گھونسلے میں رکھ چھوڑتے ہیں وہ بچے کے سکھ اور سہولت میں اضافہ کرتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رنگیلا اپنی پیدائش کے اگلے دن ہی اپنی چونچ اپنے آپ کھول دیتا اور اپنے گلابی رنگ کے جسم کو دھونکنی کی طرح پھلا دیتا تھا جب اس کے ماں باپ اپنے

گھونسلے کو لوٹتے تھے۔ اس کی ماں یا باپ اس کے کھلے ہوئے منہ میں اپنی چونچ ڈال کر اپنا دودھ ٹپکا دیتا۔ یہ دودھ ان کے جسم کے اعضاء میں باجرے کے ان دانوں سے بنتا تھا جو وہ کھاتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ جو غذا وہ اس کے منہ میں ڈالتے تھے وہ بہت نرم ہوتی تھی۔ کبوتر کا بچہ چاہے ایک مہینے کا بھی ہو چکا ہو اس کے ماں باپ اسے کوئی دانہ تب تک کھانے کو نہیں دیتے جب تک اس دانے کو کچھ دیر اپنے حلق میں نہ رکھ لیں۔ اس سے غذا کا وہ دانہ نرم ہو جاتا ہے اور بچے کے نرم معدے میں آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

ہمارا رنگیلا کبوتر خاصا پیٹو تھا۔ وہ اپنے ماں باپ میں سے ایک کو اسی کام میں لگائے رکھتا تھا کہ وہ اس کے لیے خوراک لائے اور دوسرا اسے چھاتی سے لگا کر بیٹھا رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا باپ بھی اس کی دیکھ بھال کے لیے کم محنت نہیں کرتا تھا۔ تعجب کی کوئی بات نہیں کہ رنگیلے کا بدن بہت موٹا ہو گیا۔ اس کا گلابی رنگ بہت جلدی زردی مائل سفید رنگ میں تبدیل ہو گیا جو پروں کے نکلنے کی پہلی علامت ہے۔ اس کے بعد اس کے کھردرے نوکدار اور سفید پر نکل آئے جو گول اور قدرے سخت تھے بالکل خار پشت جانور (ساہی) کے بدن پر اُگی ہوئی سوئیوں کی طرح۔ اس کے منہ اور آنکھوں کے گرد جو زرد رنگ کے حلقے تھے وہ جھڑ گئے۔ پھر دھیرے دھیرے چونچ نکل آئی جو مضبوط، تیکھی اور لمبی تھی۔ اور واہ کتنا مضبوط تھا جبڑا —— جب وہ لگ بھگ تین ہفتوں کا ہوا تو اپنے ڈربے کی جس موری میں وہ بیٹھا تھا وہاں اس کے قریب ایک چیونٹی رینگتی ہوئی گزری۔ کسی کی ہدایت کے بغیر ہی اس نے اسے چونچ مار دی سالم چیونٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ تب اس نے اپنی چونچ مردہ چیونٹی کے نزدیک لا کر معائنہ کیا کہ اس نے کیا کارنامہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رنگیلا نے اس کالی چیونٹی کو کوئی دانہ سمجھ لیا تھا اور اس طرح ایک بے گناہ راہگیر کو مار ڈالا تھا جو کبوتر کی نسل کا دوست تھا۔ چلئے پھر بھی اس نے دوبارہ عمر بھر کسی چیونٹی کی جان نہیں لی۔

پانچ ہفتے کی عمر پانے تک وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے پیدائشی گھونسلے سے نکل کر

اپنے قریب رکھے پانی کے برتن سے پانی پی لے۔ ابھی تک اس کے ماں باپ ہی اسے غذا
کھلاتے تھے اگرچہ اب وہ ہرروز اپنے آپ بھی خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب وہ
میری کلائی پر بیٹھ جاتا اور میری ہتھیلی پر سے دانہ چگ لیتا تھا۔ وہ اسے دو تین مرتبہ گلے میں اچھالتا
جیسے کوئی مداری یا جادوگر گیند ہوا میں اچھالتا ہے اور پھر اسے نگل جاتا۔ جتنی مرتبہ رنگیلا یہ عمل کرتا وہ
اپنا سر گھما کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا جیسے کہہ رہا ہو ''میں یہ کام ٹھیک ٹھاک کر رہا ہوں نا؟
میرے والدین جب چھت پر سے دھوپ سینک کر آجائیں آپ انہیں بتادیں کہ میں کتنا ہوشیار
ہوں۔ اس کے باوجود میرے سبھی کبوتروں میں سے وہی ایک ایسا تھا جس نے سب کے مقابلے
میں زیادہ سست رفتار سے اپنی قوت کو پہنچا۔

بس انہی دنوں میں نے ایک نئی بات دریافت کی۔ مجھے اس سے پہلے معلوم ہی نہیں تھا
کہ کبوتر آندھی میں بھی بنا روک ٹوک یوں اڑ سکتے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دھول پڑنے سے ان
کی آنکھیں نہیں چندھیاتیں۔ لیکن جوں جوں رنگیلا کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا ایک دن مجھے لگا کہ
اس کی آنکھوں میں ایک باریک پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنی بینائی کھو رہا ہے۔ اس پر
حیران ہو کر میں نے اسے چہرے کے قریب لا کر غور سے معائنہ کرنے کے بارے میں سوچا۔
جونہی میں نے یہ اقدام کیا رنگیلے نے اپنی سنہری آنکھیں کھول دیں اور پلٹ کر ڈربے کے عقبی حصے
میں چلا گیا۔ پھر بھی میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے اوپر چھت پر لے گیا۔ میں نے مئی مہینے کی تپش
آلود دھوپ میں اس کی آنکھ کی پتلی کا معائنہ کیا۔ جی ہاں! تب پتہ چلا کہ اس کی آنکھ کی پتلی کے
ساتھ ایک اور باریک سی پتلی جڑی ہوئی ہے بالکل دھانی کاغذ جیسی نرم اور باریک۔ اور جتنی بار
میں اس کا چہرہ سورج کی جانب کرتا وہ اپنی آنکھوں کے سنہری حلقوں کے اوپر وہ نرم سی جھلی اوڑھ
لیتا۔ اس طرح مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ آنکھ کے لیے یہ ایک حفاظتی جھلی ہے جو اس پرندے کو آندھی
میں، یا سورج کی جانب سیدھی اڑان بھرنے میں مددگار ہوتی ہے۔

مزید ایک پکھواڑے میں رنگیلے کو اڑنا سکھا دیا گیا۔ چاہے وہ پیدائش ہی سے ایک پرندہ

تھا پھر بھی یہ آسان کام نہیں تھا۔ آدمی کے بچے کو چاہے پانی کا شوق ہو لیکن جب بھی وہ تیرنے کا
ہنر سیکھتا ہے اس سے غلطیاں ہوتی ہیں اور پانی اس کے گلے میں چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی میرے کبوتر
کے ساتھ ہوا۔ اس میں بھی پنکھ کھولنے کے وقت خود اعتمادی نہ تھی اور وہ گھنٹوں ہماری چھت پر ہی
بیٹھا رہا جہاں آسمان میں لہراتی ہوائیں اُسے اڑنے کے لیے جلد آمادہ نہیں کر سکیں۔ آیئے اس
بات کو واضح کرنے کے لیے میں آپ کو اپنی چھت کی تفصیل بتاؤں۔ اس کے اوپر پختہ سمینٹ کی
ایک حفاظتی دیوار بنی ہوئی تھی جس کی اونچائی ایک چودہ برس کے لڑکے کے قد کے برابر تھی۔ اس کی
وجہ سے کوئی نیند میں چلنے کا عادی بھی ہمارے چار منزلہ گھر کی چھت سے گرمیوں کی راتوں میں گر
نہیں سکتا تھا۔ ہم میں سے گھر کے بیشتر لوگ اس موسم میں چھت پر ہی سوتے تھے۔

میں رنگیلے کو ہرروز اس دیوار پر بٹھا دیتا وہاں وہ ہواؤں کی طرف رخ کر کے گھنٹوں
بیٹھا رہتا اور بس---ایک دن میں نے چھت کے فرش پر مٹر کے کچھ دانے رکھ دیئے اور اسے کہا
کہ وہ اچھل کر ان دانوں کو اٹھا لے۔ چند لمحوں تک وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر
میری جانب سے منہ پھیر کر اس نے دوبارہ مٹر کے دانوں پر نگاہ ڈالی۔ یہ عمل اس نے کئی بار کیا۔
جب آخر کار اُسے یقین ہو گیا کہ میں وہ نرم نوالے اس کے لیے اوپر دیوار پر پہنچانے والا نہیں تو اس
نے دیوار پر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی گردن لمبی کر کے لگ بھگ تین فٹ نیچے
پڑے ہوئے مٹر کے دانوں کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ بالآخر لگ بھگ پندرہ منٹ کی صبر آزما
پس و پیش کے بعد وہ پھدک کر نیچے آ گیا۔ جونہی اس کے پنجے فرش سے لگے اور وہ توازن کے
ساتھ مٹر کے دانوں پر آ بیٹھا تو اس کے پنکھ جو ابھی تک کھلے نہ تھے، یک بیک پورے پھیلاؤ کے
ساتھ کھل گئے۔ واہ! کیا کہنے اس فتح یابی (کامیابی) کے۔

لگ بھگ انہی دنوں میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے پنکھوں کا رنگ بدل گیا
ہے۔ ایک مبہم سے مٹیالے نیلے رنگ کی جگہ شوخ نیلا سمندری رنگ اُس کے بدن پر چمکنے لگا۔ اور
ایک صبح اُس کا گلا دفعتاً قوسِ قزح کی طرح دمک اٹھا۔

اب پیدا ہوا اہم ترین سوال اڑان بھرنے کا۔ مجھے انتظار رہا کہ اُس کے ماں باپ اُسے اڑنے کے ابتدائی سبق سکھائیں گے۔ میں صرف ایک طریقے سے ہی مدد کر سکا۔ ہر روز میں اسے اپنی کلائی پر بٹھا دیتا اور پھر اپنے بازو کو بار بار اوپر نیچے کی جانب جھلاتا۔ ایسے میں اُسے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے پنکھ کو بار بار کھولنا اور سمیٹنا پڑتا تھا۔ یہ اُس کے لیے مفید تھا لیکن میں اسے اڑنا سکھانے کے لیے بس اتنا ہی کر سکا۔ آپ یہ پوچھیں گے کہ مجھے اس کام میں جلد بازی کی ضرورت کیا تھی۔ وہ اڑنے کے ہنر سے پہلے ہی خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ اور ماہِ جون میں بھارت میں بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ برسات کا موسم شروع ہو جانے پر لمبی پرواز ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے دِشاؤں کی پہچان جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہ ہو جائے۔

تاہم مئی مہینے کے خاتمے سے خاصا عرصہ پہلے رنگیلا کے باپ نے اس کام کا بیڑہ اٹھا لیا۔ خاص اُسی دن وہ تیز شمالی ہوا تھم گئی جو شہر میں کچھ عرصہ سے چل رہی تھی اور شہر کے ماحول کو سرد بنائے ہوئے تھی۔ آسمان شفاف نیلم پتھر کی مانند صاف تھا۔ فضا اِس قدر صاف تھی کہ ہمارے شہر کے مکانوں کی چھتیں صاف دکھائی دیتی تھیں بلکہ اُس سے آگے دُور دُور تک دیہات کے کھیت اور پیڑ پودوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ اُس روز تین بجے بعد دوپہر رنگیلا کبوتر ہماری چھت کی پختہ دیوار پر دھوپ سینک رہا تھا۔ اُس کا والد جو ہوا میں اِدھر اُدھر اڑتا رہا تھا، نیچے اترا اور رنگیلے کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے عجیب سی نظر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "ارے او سست ہڈیوں والے! اب تم تقریباً تین مہینے کے ہو چکے ہو اور ابھی تک تمہیں اڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میاں! تم کبوتر ہو یا کوئی کیڑا مکوڑا؟" لیکن ذی شان رنگیلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر اُس کا باپ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے کبوتروں کی بولی میں اُس پر گٹکنا اور جھپٹنا شروع کر دیا۔ اس بری بھلی پھٹکار سے بچنے کے لیے رنگیلا ایک طرف ہٹ گیا لیکن اس کے باپ نے 'گٹکتے گٹکتے' جھپٹتے ہوئے اور اپنے پنکھ پٹکتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ رنگیلا اور پیچھے اور پیچھے کھسکتا گیا لیکن بڑے میاں نے نرم پڑنے کے بجائے مزید تیز لہجے میں جلی کٹی سنانی شروع کر دی اور اُس کا پیچھا کرتے

کرتے اُسے دیوار کے آخری سرے کے اتنا قریب پہنچا دیا کہ اب چھت سے پھسل پڑنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا۔ یکا یک اس کے باپ نے اپنے بوڑھے جسم کے ڈھانچے کا پورا وزن رنگیلے کے جوان جسم پر ڈال دیا۔ ابھی رنگیلا آدھا فٹ بھی نیچے نہیں آیا تھا کہ اس نے پنکھ کھول دیئے اور اڑ چلا۔ آہا! یہ سبھوں کے لیے کتنا مسرّت خیز لمحہ تھا۔ رنگیلے کی ماں جو زینے کے نیچے پانی میں خود کو بھگو کر بعد دوپہر کا ہار سنگار کر رہی تھی، زینہ چڑھ کر اوپر آ گئی اور اڑان میں اپنے بیٹے کی رفاقت کرنے لگی۔ اپنے اڈّے پر واپس آنے سے پہلے وہ کم از کم دس منٹوں تک چھت کے اوپر چکّر لگاتے رہے۔ جب وہ چھت پر واپس پہنچے تو ماں کبوتری نے معمول کے مطابق اپنے پر سمیٹ لیے اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ لیکن بیٹے کا حال مختلف تھا۔ وہ خوف زدہ تھا بالکل ایسے جیسے کوئی لڑکا ٹھنڈے اور گہرے پانی میں اترتے ہوئے ہراساں ہوتا ہے۔ وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے پنکھ زور زور سے پھڑ پھڑاتے ہوئے اور چھت کے اوپر تندی کے ساتھ تیرتے ہوئے، جب وہ واپس چھت پر اترا تو بڑے محتاط قدموں سے چھت پر چلنے لگا۔ اس کا پورا بدن خوف سے کانپ رہا تھا۔ آخر جب اس کی چھاتی دیوار کے کنارے سے جا کر ٹکرائی تو وہ رک گیا اور اس نے اپنے پنکھ یوں جلدی سے سمیٹ لیے جیسے ہم پنکھا بند کرتے ہیں۔ رنگیلا جوش کے مارے ہانپ رہا تھا جبکہ اس کی ماں اسے اپنی چھاتی سے لگا کر سہلانے لگی جیسے وہ ننھا سا بچہ ہو جسے چھاتی سے لپٹا کر رکھنے کی ضرورت ہو۔ اس کا باپ یہ دیکھ کر اُس کا مطلوبہ کام کامیابی سے سرانجام ہو چکا ہے، نیچے غسل کرنے چلا گیا۔

سمت کا پتہ لگانے کی تربیت

اب رنگیلا کبوتر ایک تربیت یافتہ غوطہ خور کی طرح ہوا میں چھلانگ لگانے کے ڈر پر قابو پا چکا تھا، اس میں اب زیادہ لمبی اور اونچی اڑانیں بھرنے کی ہمت آ گئی تھی۔ ہفتے بھر میں وہ آدھا گھنٹہ مسلسل پرواز کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور جب وہ اڑان بھرنے کے بعد چھت پر اپنے گھر واپس آتا تو اسی طرح خوش اسلوبی سے نیچے اترتا تھا جیسے اس کے والدین اترتے تھے۔ اب جب اس کے قدم واپس چھت کو چھوتے تو اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے خوف زدہ ہو کر زور زور سے پنکھ مارنے نہیں پڑتے تھے۔

اس کے ماں باپ جو اس کی ابتدائی اڑانوں میں اُس کے ہمراہ رہا کرتے تھے، اب اسے اور اونچا پرواز کرنے کے لیے پیچھے چھوڑ کر آ جاتے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے لگا کہ وہ اسے اور اونچا اور اونچا اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ بیٹا اپنے والدین کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کے بزرگ اس ننھے کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کر رہے تھے لیکن ماہِ جون کے شروع میں ایک دن میرے اس وشواس کو دھکا لگا جس کی وجہ تھی ذیل کا منحوس واقعہ۔ رنگیلا بہت اونچائی پر اڑ رہا تھا اور وہ اپنے معمول کے قد سے لگ بھگ آدھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے بھی اوپر اڑ رہے تھے اور اتنے چھوٹے نظر آ رہے تھے جتنی ایک انسان کی مٹھی

ہوتی ہے۔ وہ ایک جھولے کے تسلسل کے ساتھ رنگیلا کے اوپر ہی چکّر کاٹ رہے تھے۔ یہ عمل اکتا دینے والا اور بے معنی سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی نظر ان کی طرف سے ہٹا لی چونکہ لگاتار ٹکٹکی لگا کر اوپر کی جانب زیادہ دیر تک دیکھتے رہنا مشکل تھا۔ جب میں نے نگاہیں ان کی طرف سے ہٹا کر نیچے افق کی جانب دیکھا تو ایک سیاہ دھبّہ تیزی سے حرکت کرتا ہوا نظر آیا جس کا قد ہر سیکنڈ بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کس قسم کا پرندہ ہے جو ایک سیدھی لکیر کی طرح اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے چونکہ ہندوستان میں ایسے پرندوں کے نام سنسکرت میں ''ترِیاک'' یا ''موڑ کا کھوجی'' ہیں۔

لیکن یہ پرندہ تو تیر کی طرح سیدھا لپک رہا تھا۔ مزید دو منٹوں میں میرے شکوک دور ہو گئے۔ یہ تو ایک باز تھا جو ننھے رنگیلا کو شکار کرنے کے لیے لپک رہا تھا۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا اور ایک معجزہ نما منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ رنگیلے کا باپ اس کی سطح پر پہنچ پانے کے لیے نیچے کو لڑھک رہا تھا جبکہ اس کی ماں بھی اسی مقصد کے لیے نیچے کو موڑ کاٹ رہی تھی۔ وہ خوفناک باز اس معصوم ننھے رنگیلا سے کوئی دس گز کے فاصلے پر آن پہنچا مگر اس سے پہلے رنگیلا کے دائیں بائیں اُس کے ماں باپ آ گئے اور اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اب یہ تینوں اپنے دشمن کے راستے سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے عموداً نیچے کی جانب اڑ چلے۔ ان کے اس اقدام سے اٹل رہ کر باز نے حملہ کر ہی دیا۔ فوراً ان تینوں کبوتروں نے نیچے غوطہ لگایا جس سے اس کا وار خالی گیا۔ لیکن جس تندی سے باز نے حملہ کیا تھا وہ اس قدر شدید تھی کہ وہ اسے کبوتروں سے بہت دور آگے لے گئی۔ یہ کبوتر مسلسل نیچے کو رُخ کیے ہوئے لمحہ لمحہ بڑھتی ہوئی رفتار سے ہوا میں چکّر کاٹتے رہے۔ مزید ایک منٹ میں ہماری چھت تک ان کا فاصلہ آدھا رہ گیا تھا۔ اب باز نے اپنا منصوبہ بدل دیا۔ وہ آکاش میں اونچا اور اونچا چلا گیا اب وہ درحقیقت اتنا اونچا اٹھ گیا تھا کہ ان کبوتروں کو اب اس کے پنکھوں میں ہوا کی سنسناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی چونکہ وہ اب ان سے اس قدر اوپر تھا کہ وہ اپنے دشمن کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ وہ اب محفوظ ہیں وہ بے فکر ہو کر سست پڑ گئے۔ ظاہر تھا

کہ اب وہ پہلے جتنی تیز رفتار سے نہیں اڑ رہے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ ان کے عین اوپر باز اپنے پنکھ سمیٹ رہا تھا اب وہ ان پر جھپٹنے والا تھا۔ پل بھر میں وہ پتھر کی طرح ان پر آن گرا۔ میں نے مایوسی میں اپنی انگلیاں منہ میں ڈال کر چیخ جیسی آواز میں سیٹی بجائی جو ایک چیتاؤنی تھی۔ کبوتروں نے گرتی ہوئی تلوار سے بچنے کے لیے نیچے کو غوطہ لگایا پھر بھی باز نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ انچ انچ اور پل پل ان کے قریب آ رہا تھا۔ اور تیز، اور تیز لپکتا ہوا، اور لو اب تو اس کے اور اس کے شکار کے درمیان مشکل سے بیس فٹ کی دوری رہ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا نشانہ رنگیلا کبوتر ہی ہے۔ اس کے ناپاک پنجے مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ میں انتہائی کرب کے عالم میں سوچ رہا تھا، کیا یہ احمق پرندے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ ترکیب نہیں کریں گے؟ اب وہ ان سے اس قدر قریب آ چکا تھا۔ کاش وہ اپنی عقل سے کام لے سکیں۔ عین اسی وقت انہوں نے اوپر کی جانب ایک وسیع چکر کاٹا۔ باز نے ان کا تعاقب کیا۔ تب وہ ایک ہموار لیکن وسیع بیضوی راستے پر اڑنے لگے۔ اگر کوئی پرندہ دائرے میں اڑتا ہے تو اس کا جھکاؤ اس دائرے کے مرکز کی طرف ہوتا ہے یا اس سے دور— اب باز ان کے ارادے کو بھانپ نہیں سکا۔ اس نے مرکز کی طرف رخ موڑ لیا۔ اس طرح کبوتروں کی اڑان کے بہت کشادہ دائرے کے اندر ہی اندر وہ ایک تنگ دائرے میں اڑنے لگا۔ جونہی ان کبوتروں کی طرف اس کی پیٹھ ہوئی تینوں کبوتروں نے ایک اور غوطہ سیدھا ہماری چھت کی جانب لگایا لیکن وہ منحوس باز ٹلا نہیں۔ گرنے والی سیاہ بجلی کی زبان کی طرح وہ ان کے پیچھے پیچھے رہا۔ اس کے شکار نے ہماری چھت کی جانب ایک ٹیڑھی لکیر کی صورت ڈبکی لگائی اور بالآخر وہ میرے پھیلے ہوئے بازؤں تلے محفوظ ہو گئے۔ اسی لمحے میں نے ہوا میں ایک چیخ سی سنی۔ باز میرے سر سے کوئی ایک فٹ اوپر سے اڑتا ہوا گزرا۔ اس کی آنکھوں میں زرد رنگ کی آگ کی دہک تھی اور اس کے پنجے کسی سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے۔ جب وہ اوپر سے گزرا تو مجھے اُس کے پنکھوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی سنسناہٹ سنائی دی۔

اس طرح میرے پالتو پنچھیوں کے بال بال بچ جانے کے بعد میں نے رنگیلے کو سمت کو

سمجھنے کی تربیت دینا شروع کیا۔ ایک دن میں ان تینوں کبوتروں کو پنجرے میں ڈال کر اپنے شہر کے مشرق میں لے گیا۔ صبح کے ٹھیک نو بجے میں نے انہیں پنجرے سے آزاد کر دیا۔ وہ بحفاظت گھر واپس آ گئے۔ اگلے روز اتنا ہی فاصلہ طے کر کے انہیں شہر کے مغرب کی جانب لے گیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ ہر ایک سمت میں کم از کم پندرہ میل کے نصف قطر تک سے ہمارے گھر کا راستہ جان گئے۔

چونکہ اس دنیا میں کوئی بھی کام بنا روک ٹوک مکمل نہیں ہوتا، رنگیلے کی تربیت میں بھی بالآخر ایک اڑچن آ گئی۔ میں اسے اور اُس کے ماں باپ کو ایک کشتی میں دریائے گنگا کے دہانے کی سمت میں لے کر گیا۔ جب ہم گھر سے روانہ ہوئے اس وقت صبح کے لگ بھگ چھ بجے تھے۔ آسمان پر کچھ اکا دکا بادل منڈلا رہے تھے اور جنوب کی سمت سے معتدل ہوا چل رہی تھی جو نہ تیز تھی نہ ہلکی۔ ہماری کشتی میں اوپر تک چاول بھرے ہوئے تھے۔ برف جیسے سفید— اور پھر ان کے اوپر سرخ اور سنہری رنگ کے آموں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پہاڑ کی دودھیا چوٹی پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی شعلہ زن ہو۔

مجھے پہلے ہی سے یہ قیاس کر لینا چاہئے تھا کہ ایسا مبارک موسم ایک خوفناک طوفان میں بھی بدل سکتا ہے۔ ہر چند کہ میں لڑکپن ہی میں تھا، پھر بھی مجھے جون کی مون سونی برسات کی متلون مزاجی کا تو کچھ علم تھا ہی۔

ابھی ہم نے مشکل سے بیس میل کا سفر ہی طے کیا تھا جب موسم کے پہلے برساتی بادلوں نے آسمان پر دوڑ لگانی شروع کر دی۔ ہوا کی رفتار اس قدر تند و تیز تھی کہ وہ ہماری کشتی کا ایک بادبان پھاڑ کر لے گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اب مزید وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا میں نے پنجرہ کھول کر ان پرندوں کو آزاد کر دیا۔ جب تیز ہواؤں سے ان کا سامنا ہوا تو وہ بہت کم بلندی پر اڑنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پانی میں گر رہے ہوں۔ اس طرح وہ چوتھائی گھنٹہ تک دریا کی سطح کے ساتھ ساتھ ہی اڑتے رہے۔ اگلے دس منٹوں میں وہ سلامتی سے زمین کی جانب رخ کئے ہوئے اڑتے دکھائی

دیئے۔ عین اس گھڑی جب وہ ہمارے بائیں طرف کے گاؤں تک پہنچے، آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ موسلادھار بارش نے ہر چیز پر سیاہی پھیر دی اور ہمیں سیاہ رنگ کے پانی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اِس پانی کے بیچوں بیچ کبھی کبھی بجلی کی چمک ٹیڑھی میڑھی لکیر کی صورت لہراتی موت کا ناچ، ناچ رہی تھی۔ اب میں نے اپنے پالتو پرندوں کو پھر سے پانے کی آس چھوڑ ہی دی۔ ہم خود بھی بہ حفاظت کنارے تک پہنچنے کی آس چھوڑ چکے تھے لیکن خوش قسمتی سے ہماری ناؤ ایک گاؤں کے گھاٹ پر لگ گئی۔ اگلی صبح جب میں ریل سے گھر واپس آیا تو یہاں مجھے تین کی جگہ دو بھیگے ہوئے کبوتر ملے۔ رنگیلے کا باپ طوفان میں ہلاک ہو گیا تھا۔ بلا شبہ اس میں سارا قصور میرا ہی تھا۔ اور آنے والے چند دنوں تک ہمارا گھر ماتم کدہ بنا رہا۔ جب کبھی برسات کچھ دیر کو رکتی میں دونوں کبوتروں کو ساتھ لے کر چھت پر چلا جاتا تا کہ ہم لامتناہی آسمان کی حدوں میں والد کبوتر یعنی رنگیلے کے باپ کی ایک جھلک کہیں پا سکیں۔ افسوس کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔
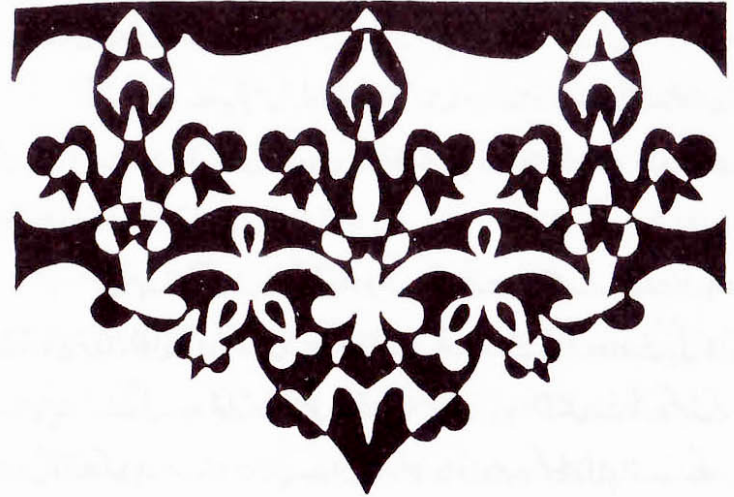
رنگیلا ہمالیہ میں

برسات اور گرمی کی شدت دونوں بہت بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا ہم لوگوں نے پہاڑوں پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ اگر بھارت کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو اس کے شمال مشرق میں دارجیلنگ نام کا ایک شہر نظر آئے گا جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کے بالمقابل واقع ہے۔
ہم ایک قافلے کی شکل میں مزے مزے سے چل کر دارجیلنگ سے کئی دنوں کا سفر طے کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں دین تام میں پہنچے۔ ہمارے قافلے میں میرا خاندان، میں اور میرے دونوں کبوتر شامل تھے۔ وہاں ہم سطح سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ امریکہ کا کوئی پہاڑ ہوتا یا ایلپس (Alps) تو اتنی اونچائی پر کم از کم کچھ برف پڑی ہوئی ضرور ملتی لیکن بھارت میں جو خطِ جدّی کے درمیان میں واقع ہے نیز ہمالیہ پر جو خطِ استوا سے بمشکل 30 درجے شمالی عرض بلد کی دوری پر ہے، برفانی خطّہ دس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے شروع نہیں ہوتا اور پہاڑوں کی ترائی کے جنگلوں میں جو حیوانات سے بھرے پڑے ہیں، ستمبر کے بعد اس قدر سردی پڑتی ہے کہ ان جنگلوں کے باشندے یعنی حیوانات جنوب کی جانب ہجرت کر جاتے ہیں۔

آیئے میں آپ کو اپنے گرد و پیش کی سرسری تصویر دکھا دوں۔ پتھروں اور گارے سے بنا ہوا ہمارا گھر ایسی اونچی جگہ واقع تھا جہاں سے چھوٹی چھوٹی وادیاں صاف دکھائی دیتی تھیں جن میں

چائے اگائی جاتی تھی۔ ان کے آگے سلسلہ وار کھڑی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان، جو اوبڑکھابڑ لیکن ذی شان پیچ وخم میں نمایاں تھیں۔ ایسی وادیاں تھیں جن میں دھان اور مکے کے کھیت اوبڑکھابڑ اور پھلوں کے باغیچے باافراط تھے۔ ان سے اور پرے تھیں سبزے سے ڈھکی گہرے رنگ کی سدابہار ڈھلانیں جن کے پیچھے کھڑے تھے ہزاروں فٹ اونچے پاک وصاف دودھیا سلسلہ ہائے کوہ— کنچن جنگا، مکالو اور ماؤنٹ ایورسٹ۔ صبح صادق کی پہلی روشنی میں وہ بالکل سفید دکھائی دیتے تھے لیکن جوں جوں روشنی تیز اور چمکیلی ہوتی اور آفتاب اونچا اٹھتا جاتا، باری باری ہر چوٹی اپنی پہچان بتاتی تھی، افق پر زیادہ دور نہیں بلکہ آسمان کے بیچوں بیچ اُبھر کر، جہاں سے سرخ ارغوانی روشنی کا ایک سیلاب اُمڈ پڑتا تھا، قربانی کے خون کی دھار کی طرح۔

عام طور پر ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کا نظارہ صبح سویرے زیادہ صاف ہوتا ہے چونکہ اس کے بعد دن کے باقی حصّے میں وہ بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ ہندو جو دھارمک سنسکاروں والے لوگ ہوتے ہیں ان شاندار بلند پہاڑوں کا جلوہ دیکھنے اور ایشور کی عبادت کرنے کے لیے سویرے ہی بیدار ہو جاتے ہیں۔ کیا عبادت کے لیے ان پہاڑوں سے زیادہ موزوں بھی کوئی ماحول ہو سکتا ہے جن کی بعض چوٹیوں کو ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا اور جن پر ابھی تک انسان کے قدم نہیں پڑے۔ ان کی اچھوتی (غیر آلودہ) پاکیزگی ایک ایسی انمول شے ہے جو ربانیت (الوہیت) کی ایک ابدی مظہر ہے۔ ایورسٹ جیسی بلندیاں سب سے بلند حقیقت— پرماتما (خدا) کی مظہر ہیں اور اس کی پراسراریت کی بھی چونکہ جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ بلندیاں سوائے صبح سویرے کے پورا دن بادلوں سے ڈھکی رہتی ہیں۔ غیر ملکی ہندوستان میں انہیں دیکھنے کے لیے آتے ہیں، فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ہر وقت انہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن کسی کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے چونکہ جس نے بھی ایورسٹ کی صبح سویرے کی شوکت اور اس کے مرعوب کن جلال کا نظارہ کیا ہو یہی کہہ اٹھے گا کہ یہ اس قدر پُر جلال ہے کہ تمام دن اِس پر نگاہ نہیں ٹکائی جا سکتی۔ اسے مسلسل اپنی نگاہ کے سامنے رکھنے کی تاب کس میں ہے؟

جولائی، چونکہ برسات کا مہینہ ہوتا ہے، اس میں ایورسٹ کا جلوہ دیکھنا امکان سے باہر ہوتا ہے چونکہ تمام پہاڑ بھیانک اور غارت گر برفانی طوفانوں کی زد میں ہوتے ہیں۔ طوفانوں کی لائی ہوئی برف سے جوجھتی یہ چوٹیاں شاذ و نادر ہی نگاہ کے سامنے ابھرتی ہیں— ٹھوس برف اور سفید آگ کے ایک پیوستہ انبار کی صورت میں— سورج کی روشنی میں وہ شدت سے چمک اٹھتی ہیں جبکہ ان کے قدموں میں برفانی بادل یوں طواف کرتے ہیں اور گرتے ہیں جیسے مجذوب درویش دیوانہ وار ناچتے ہوئے اپنے پُر ہیبت دیوتا کے آگے گرتے ہیں۔

موسمِ گرما کے دوران میرا دوست رادجا اور ہمارے جنگلاتی علم و ہنر کا معلّم بزرگوار گھونڈ ہمارے گھر پر ملنے آئے۔ رادجا کی عمر تقریباً سولہ سال تھی۔ اور گھونڈ کو ہم ہمیشہ بزرگوار ہی کہا کرتے تھے چونکہ ان کی عمر کا کسی کو علم نہیں تھا۔ حیوانات کی زندگی اور جنگلات کے رموز کے بارے میں تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے مجھے اور رادجا کو اُس قابل ترین شکاری کے زیرِ رہنمائی کر دیا گیا۔ چونکہ اپنی دوسری تصانیف میں میں اس کے بارے میں مفصّل معلومات دے چکا ہوں اس لیے یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

دین تام میں اطمینان سے ڈیرہ جما چکنے کے فوراً بعد میں نے اپنے کبوتروں کو جہت سادھنے کا ہنر سکھانا شروع کر دیا۔ جب کبھی دن ابر آلود نہ ہوتا ہم دوپہر سے پہلے شاہ بلوط اور گُل مہندی کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے اونچی چوٹیوں کی جانب چڑھائی چڑھتے اور اپنے کبوتروں کو کسی بُدھ وہار کی چھت سے یا کسی رئیس کے گھر کی چھت سے کھلا چھوڑ دیتے اور شام کے وقت جب ہم گھر لوٹتے تو رنگیلا اور اُس کی والدہ کو یقینی طور پر ہم سے پہلے وہاں پہنچا ہوا پاتے۔

جولائی کے پورے مہینے میں مشکل سے چھ دن ہی ایسے گزرے جو ابر آلود نہ تھے، پھر بھی ہر چیز کا علم رکھنے والے گھونڈ کی رہنمائی میں اور اپنے دوست رادجا کی رفاقت میں ہم نے بہت تھوڑے عرصے میں کافی طویل سفر طے کر لیا۔ ہم ہر طرح کے پہاڑی لوگوں سے ملے اور ان کے یہاں قیام کیا۔ یہ لوگ شکل و شباہت میں زیادہ تر چینی لوگوں سے مشابہہ تھے۔ ان کے طور

اطوار شائستہ تھے اور وہ مہمان نوازی میں فیاض اور فراخدل تھے۔ بے شک ہم اپنے کبوتروں کو ساتھ لے جاتے تھے، کبھی کبھی پنجروں میں بند کر کے لیکن بیشتر وقت انہیں ہم اپنے پٹکے میں چھپائے رکھتے تھے۔ اگرچہ ہم اکثر بارش میں بھیگ جاتے تھے لیکن رنگیلے اور اُس کی ماں کو کمالِ احتیاط سے موسم کی زد سے محفوظ رکھتے تھے۔

جولائی کے آخر میں ہم نے ان سبھی وہاروں اور سکم کے جاگیردار کے قلعے سے بھی آگے کا سفر کیا۔ مذکورہ سبھی مقامات تک ہم تینوں آدمی اور دونوں کبوتر جا چکے تھے اور ان کے بارے میں پوری طرح جان چکے تھے۔ ہم سِنگا لیلا سے بھی گزرے جہاں ایک چھوٹا سا عمدہ وہار تھا۔ اُس سے بھی آگے ہم پھالوت اور انجانے علاقے کی جانب نکل گئے۔ آخر کار ہم عقابوں کے وطن میں پہنچ گئے۔ ہمارے چاروں طرف گرینائٹ کی سنگین ننگی چٹانیں تھیں جو صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی تھیں اور چیڑ کے پست قد پیڑوں سے۔ ہمارے سامنے شمال کی جانب کنچن جنگا اور ایورسٹ کی چوٹیاں کھڑی تھیں۔ یہاں ایک گہری گھاٹی کے کنارے پر سے ہم نے اپنے دونوں کبوتروں کو چھوڑ دیا۔ اُس ولولہ انگیز ہوا میں وہ ایسے اڑے جیسے بچے چھٹی ہونے پر اسکول سے بھاگے بھاگے آتے ہیں۔ رنگیلے کی ماں تو اپنے بیٹے کو عظیم بلندیاں دکھانے کی غرض سے اور بھی اوپر کی طرف پرواز کرنے لگی۔

جب یہ دونوں پرندے اڑتے ہوئے دور نکل گئے تو ہم تینوں اشخاص اِس معاملے پر باہم گفتگو کرنے لگے کہ ان بلندیوں پر تیزی سے اڑتے ہوئے کبوتروں کو کیا کیا دیکھنے کو ملے گا۔ بلا شبہ ان کے سامنے کنچن جنگا کے کوہستانی سلسلے کی دو جُڑواں چوٹیاں اوپر اٹھی ہوئی تھیں جن کی بلندی ایورسٹ سے قدرے کم تھی لیکن جو اتنی ہی غیر آلودہ، پاک، سنگین اور دشوار گزار تھیں جتنی کہ ایورسٹ کی بے داغ اچھوتی چوٹی جس پر ابھی تک انسانی قدم نہیں پہنچ پائے تھے۔ یہ سچائی ہمارے لیے جذبات انگیز تھی۔ ہم نے اس چوٹی کو دُور سے بس چند منٹوں تک مسلسل دیکھا۔ ہمیں ایسا لگا جیسے خدا نے اپنے چہرے کے آگے آئینہ رکھ لیا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اے تقدیس کی

ابدی چوٹی! خدا کرے کوئی انسان بھی تجھے آلودہ نہ کر سکے! اور نہ ہی کوئی فانی مخلوق تیری تقدیس کو اپنے ذرا سے لمس سے بھی داغ لگا سکے! ایشور کرے تو ہمیشہ ناقابلِ تسخیر رہے۔ تو کہ کائنات کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور ابدیت کی انتہا۔''

لیکن میں آپ کو اتنی اونچائی پر محض پہاڑوں کی تفصیل بتانے کے لیے نہیں لایا۔ بلکہ ایک پُرخطر مہم کے بارے میں آپ کو بتانا ہے جو ہمیں وہاں پیش آئی۔ اب جب رنگیلا اور اس کی اماں جان اڑ کر دور جا چکے تھے ہم نے ان کی جانب دیکھنا چھوڑ دیا اور کسی عقاب کے گھونسلے کی تلاش میں چل دیئے جو ایک نواحی چٹان پر واقع تھا۔ ہمالیائی عقاب کا رنگ خاکستری اور سنہری دمک والا ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتا ہے اور اس کے بدن میں خوبصورتی اور طاقت دونوں کا مکمل تناسب ہوتا ہے، تاہم یہ ایک خونخوار شکاری پرندہ ہوتا ہے۔

لیکن اس دوپہر کو ہمیں کوئی ڈراونی بات نظر نہیں آئی۔ اس کے برعکس ہم نے ایک گھونسلے میں دو ملائم سے سفید عقاب کے بچے دیکھے۔ وہ نومولود بچوں کی طرح دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ جنوبی ہوا سیدھی ان کی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھی لیکن وہ اس سے پریشان نہیں تھے۔ ہمالیائی عقاب فطرتاً ہی اپنا گھونسلا ہوا کے رخ کے مقابل ہی تعمیر کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ بظاہر یہ پرندہ اس چیز کو سامنے رکھنا پسند کرتا ہے جس پر وہ آسمان میں تیرتا ہے۔

یہ ننھے بچے لگ بھگ تین ہفتے کے تھے چونکہ اپنی پیدائش کے دن والی روئی جیسی شکل وشباہت کو چھوڑ کر وہ سچ مچ کے پر و بال نکال رہے تھے۔ ان کی عمر کے لحاظ سے ان کے پنجے زیادہ نوکیلے تھے اور چونچیں بھی سخت اور کٹیلی۔

عقاب کا آشیانہ کھلا اور وسیع ہوتا ہے۔ اس کے اندر داخل ہونے کا تختہ یا یوں کہئے کہ اڑان سے واپس اترنے کا مقام تقریباً چھ سات فٹ چوڑا اور صاف ستھرا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر تنگ اور اندھیرے حصے میں ٹہنیوں اور شاخوں کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا ہے یا اُس کے شکار کئے ہوئے پرندوں کے تھوڑے سے بال و پر چونکہ شکار کے بدن کے باقی سبھی اعضا تو عقاب بچے نگل

چکے ہوتے ہیں۔ان کے ماں باپ تو اپنے شکار کی بیشتر ہڈیاں اور پنکھ بھی ان کے گوشت کے ساتھ ہی چٹ کر جاتے ہیں۔

ہر چند کہ گرد و نواح کا علاقہ ٹھگنے قد کے چیڑ کے پیڑوں سے ڈھکا ہوا تھا' یہاں پرندوں کا خوب شور و غل ہوتا تھا۔صنوبر کے درختوں میں انوکھے کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ارغوانی آرکِڈ کی جھاڑیوں میں رتنوں کے رنگوں والی مرصّع مکھیاں اپنے نیلے پروں پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ براس کے بڑے بڑے پھول جن میں سے کچھ چندا ماما کے قد کے تھے، دہکتے ہوئے لگ رہے تھے۔کبھی کبھی کسی جنگلی بلّی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔لگتا تھا جیسے وہ قیلولہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہی ہو۔

اچانک ہی گھونڈ نے ہمیں کہا کہ ہم دس بارہ گز دور بھاگ کر کسی جھاڑی میں چھپ جائیں۔ہم نے ایسا کیا ہی تھا کہ ہمارے آس پاس کا شور کم ہونے لگا۔اگلے ساٹھ سیکنڈوں میں کیڑوں مکوڑوں نے بھی بھنبھنانا بند کر دیا۔پرندوں کی آوازیں بھی خاموش ہوگئیں یہاں تک کہ پیڑ بھی کسی کے انتظار میں خاموش لگنے لگے۔فضا میں دھیرے دھیرے کسی چیز کی دھیمی سی سیٹی کی آواز سنائی دی۔چند لمحوں میں یہ بالکل مدھم ہوگئی۔پھر ایک چیخ جیسا آسیبی شور سنائی دیا اور ایک دیو ہیکل پرندہ عقاب کے گھونسلے کی جانب اڑ کر آیا۔ہوا ابھی تک اس کے پنکھوں میں سنسنا رہی تھی۔اُس کے قد سے گھونڈ نے قیاس کیا کہ یہ ان دو عقاب بچوں کی ماں ہے۔وہ تب تک ہوا میں بے حرکت رہی جب تک وہ چھوٹے بچے اپنے گھر کے اندرونی ٹھکانے میں نہیں لوٹ گئے۔اس کے پنجوں میں کسی بڑے خرگوش جیسی موٹی کھال والی کوئی چیز لٹکی ہوئی تھی۔وہ گھونسلے کے بیرونی اڈّے پر اتری اور اپنے شکار کو وہاں رکھ دیا۔صاف نظر آتا تھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُس کے پنکھوں کا ناپ کوئی چھ فٹ ہوگا۔اُس نے اپنے پنکھ اس طرح سمیٹے جیسے کوئی آدمی کسی کاغذ کو تہہ کرتا ہے۔پھر اپنے بچوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے اپنے پنجے اندر کو کھینچ لیے تاکہ ان بچوں کے دفاع سے عاری نازک گوشت والے جسم ان پنجوں سے زخمی نہ ہو جائیں۔پنجے سمیٹے

ہوئے اب وہ لنگڑاتی ہوئی سی ان بچوں تک گئی۔دونوں ننھے دوڑ کر اپنی ماں کے ادھ کھلے پنکھوں کے نیچے دبک گئے۔لیکن وہ چھاتی سے لپٹنا نہیں چاہ رہے تھے چونکہ وہ بھوکے تھے۔اس لیے وہ انہیں مرے ہوئے خرگوش کے پاس لے گئی۔اس کا کچھ گوشت کاٹ کر اس میں پیوستہ کوئی ہڈی تھی تو وہ نکال دی اور یہ انہیں نگلنے کے لیے دے دیا۔اب پھر سے نیچے اور گرد و نواح میں کیڑوں مکوڑوں اور پنچھیوں کا شور پھر سے شروع ہوگیا۔ہم بھی اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر نکل آئے اور اپنے ٹھکانے کی جانب واپس روانہ ہوگئے۔اس سے پہلے راد جانے اور میں نے گھونڈ سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ ہمیں اِس جگہ عقاب بچوں کو پورے عقاب کے روپ میں دکھانے کے لیے پھر سے لے کر آئیں گے۔

لہٰذا ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم پھر سے وہاں گئے۔ہم رنگیلے اور اُس کی والدہ کو بھی ہمراہ لے گئے چونکہ میں چاہتا تھا کہ ننھا رنگیلا وہاں سے دوبارہ اڑان بھر کر مکمّل یقین کے ساتھ وہاں کے ہر گاؤں، ہر راہب گھر، جھیل اور ندی کے بارے میں نیز وہاں کے حیوانات اور پرندوں ——— سارسوں' طوطوں' ہمالیائی بگلوں' جنگلی کل ہنسوں' غوطہ خور پرندوں' چڑی مار بازوں اور ابابیلوں سے متعلّق پوری جانکاری حاصل کر لے۔اس سفر میں ہم عقاب کے گھونسلے سے بھی سو گز آگے نکل گئے۔براس کے پھولوں کو تو موسمِ خزاں کی انگلی پہلے ہی چھو چکی تھی۔ان کی آتشیں سرخ پتّیاں جھڑ رہی تھیں اور ان کے کئی کئی فٹ اونچے لمبے تنے ہوا میں سرسرا رہے تھے۔بہت سے پیڑوں کے پتے مڑنے لگے تھے اور ہوا میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔کوئی گیارہ بجے ہم نے اپنے پرندوں کو پنجرے سے چھوڑ دیا۔وہ نیلے آسمان میں اڑ گئے جو سفید پہاڑی چوٹیوں کے ساتھ ایک بادبان کی طرح آویزاں تھا۔

وہ لگ بھگ آدھا گھنٹہ پرواز کر چکے تھے جب ایک باز ان کے اوپر اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ان دونوں کبوتروں کے قریب آگیا اور اُن پر جھپٹا لیکن شکار اس سے زیادہ چوکنا نکلا اور وہ بے ضرر بچ نکلے۔ٹھیک اسی وقت جب رنگیلا اور اس کی ماں تیزی سے نیچے درختوں کی طرف واپس

آرہے تھے باز کا جوڑی دار سامنے آگیا اور اس نے حملہ کر دیا۔ مادہ باز بھی ان پر جھپٹی جیسے اس کے شوہر نے کیا تھا لیکن ناکام رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ ان کا شکار بچ کر نکل رہا ہے نر باز نے چیختے ہوئے اپنی بیوی کو آواز لگائی' اس پر وہ ہوا میں رک گئی اور وقت کا انتظار کرتی رہی۔ کبوتروں نے خود کو محفوظ سمجھا تو انہوں نے اپنے پنکھوں کی حرکت تیز کر دی اور جنوب کی جانب اڑ چلے جبکہ دونوں بازوں نے ان کا تعاقب جاری رکھا اور مشرق اور مغرب سے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ پھر پنکھوں کی جست پر جست لگا کر انہوں نے کبوتروں کو جالیا۔ اندر کو مڑے ہوئے نوکدار کناروں والے اور قصائی کے گنڈاسے جیسے ان کے پنکھ طوفان کی طرح ہوا کو چیر رہے تھے۔ ایک......دو......تین اور بس وہ نیزوں کی طرح کبوتروں پر گرے۔ رنگیلے کی ماں رک گئی اور ہوا میں تیرنے لگی۔ اس سے بازوں کا اندازہ غلط ہو گیا۔ اب کیا کیا جائے؟ ان میں سے کون سے ایک پر جھپٹا جائے۔ یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے میں بازوں کو وقت تو لگنا ہی تھا۔ اتنی دیر میں رنگیلا نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ تیزی سے اونچا اور اونچا نکل گیا۔ کچھ پلوں میں ہی اس کی ماں نے بھی اس کی پیروی کی لیکن اس نے وقت کھو دیا تھا اور باز اس کے پیچھے پیچھے اُس کے اوپر لگ بھگ چھاتے ہوئے پہنچ گئے۔ ایسا لگتا ہے تب دفعتاً ایک خوف اس کے دل میں ابھرا۔ اُسے ڈر تھا کہ باز اس کے بیٹے کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لہٰذا بیٹے کو بچانے کے لیے، حالانکہ یہ بالکل غیر ضروری تھا، وہ ان دونوں پیچھا کرنے والوں کی جانب اڑ چلی۔ منٹ بھر میں ان دونوں شکاری پرندوں نے اسے دبوچ لیا۔ ہوا کبوتری کے پنکھوں کی بوچھاڑ سے بھر گئی۔ اِس منظر سے رنگیلا خوف زدہ ہو گیا اور وہ اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے قریب ترین چٹان پر آن گرا۔ اُس کی والدہ اپنی ہی غلطی سے اپنی جان کھو بیٹھی اور اس کے نتیجے میں اپنے بیٹے کی جان کو بھی جوکھم میں ڈال دیا۔

ہم تینوں آدمی اُس چٹان کو ڈھونڈھنے میں لگ گئے جہاں رنگیلا گرا تھا۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمالیہ کے پہاڑ بڑے پُر فریب ہیں۔ شیروں کا نہیں تو اجگروں کا سامنا ہو سکتا

تھا۔ پھر بھی میرے دوست رادجا نے اصرار کیا اور شکاری گھونڈ نے بھی یہ کہتے ہوئے اس کی رائے سے اتفاق کیا کہ اس تلاش سے ہماری واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

جس چٹان پر ہم کھڑے تھے، اس سے اتر کر ہم ایک تنگ کھائی میں داخل ہو گئے جہاں زمین پر بکھری ہوئی کچی ہڈیوں سے ہمیں یقین ہو گیا کہ شکاری جانور نے وہیں بیٹھ کر گزشتہ رات اپنے شکار کو کھا کر اپنا پیٹ بھرا تھا۔ لیکن ہم خوف زدہ نہیں ہوئے چونکہ ہمارا راہبر گھونڈ تھا جو بنگال کا مسلح ترین شکاری تھا۔ جلد ہی ہم نے ایک بڑی جاں گسل چڑھائی شروع کر دی۔ ہم کئی پہاڑی دراڑوں اور تنگ شگاف کھائیوں میں سے گزرے جن میں سبز کائی پر ارغوانی آرکڈ کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ شاہ بلوط اور گل مہندی کی بو سے ہمارے نتھنے بھر گئے۔ کہیں کہیں ہم نے دیکھا براس کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہوا سرد تھی اور چڑھائی نہ ختم ہونے والی۔ راستے میں مٹھی بھر ''چول'' (پانی میں بھگو کر نرم کی ہوئی پھلیاں) کا ناشتہ کر کے ہم دوپہر دو بجے کے بعد اس چٹان پر پہنچے جہاں رنگیلا چھپا بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم حیران ہوئے کہ یہ وہی عقابوں کا گھونسلا ہے جہاں ہم نے پچھلے سفر میں دو عقاب بچے دیکھے تھے اور جو اب پورے قد و قامت کے عقاب بن چکے تھے۔ وہ اپنے گھونسلے کے اگلے اڈّے پر بیٹھے تھے اور ہماری حیرت کی حد نہ رہی جب یہ دیکھا کہ پڑوس ہی میں ایک اور گھونسلے کے بیرونی اڈّے کے سب سے آخری کونے پر رنگیلا دبکا بیٹھا تھا۔ وہ بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر وہ عقاب بچے اپنی چونچوں سے ہم پر حملہ کرنے کے لیے آگے آئے۔ رادجا کا ہاتھ ان کے بہت قریب تھا۔ اس پر عقاب بچوں کے خوفناک وار نے اس کا انگوٹھا چیر دیا جس سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اب یہ عقاب ہمارے اور رنگیلا کے درمیان حائل تھے۔ اب اس کے سوائے اور کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ ہم ایک مزید اونچی چٹان پر چڑھ کر رنگیلا تک پہنچیں۔ ہم مشکل سے چھ گز ہی آگے گئے ہوں گے کہ گھونڈ نے ہمیں چھپ جانے کے لیے اشارہ کیا جیسا کہ ہم نے اپنے پچھلے سفر میں کیا تھا۔ ہم نے پھرتی سے ویسا ہی کیا اور چیڑ کے ایک پیڑ کے نیچے چھپ گئے۔ جلد ہی ہوا میں ایک گرج پیدا ہوئی اور عقاب بچوں کے والدین میں سے

ایک قریب ہی پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ میں ایک تیز گونج سنائی دی جب یہ عقاب اڑتا ہوا اپنے گھونسلے میں داخل ہوا۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں اوپر سے نیچے تک مسرّت کی ایک لطیف سی لہر دوڑ گئی جب عقاب کی دُم کے پنکھوں نے اُس درخت کے ساتھ رگڑ کھائی جس کے نیچے ہم چھپے بیٹھے تھے اور میں نے ہلکی سرگوشی جیسی سیٹی کی آواز بھی سنی۔

اس حقیقت کو میں وثوق کے ساتھ دہراؤں گا کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عقاب اپنا گھونسلا کیسی الگ تھلگ اور ناقابلِ رسائی چٹان پر بناتا ہے۔ ایک طاقتور پرندے یا حیوان کو اپنا ٹھکانہ چننے کے لیے اس قدر محتاط ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اتنی توفیق رکھتا ہے کہ وہ غافل ہو۔ اتنے دیوہیکل پرندے کے گھونسلے کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے کُھلی جگہ کا ہونا جہاں وہ اپنے پنکھ اپنے گھونسلے کے بیرونی آنگن میں کھول اور سمیٹ سکے اور اتنی وسیع جگہ کا کسی ناقابلِ رسائی مقام پر ہی ہونا ضروری نہیں۔ اگلی بات یہ ہے کہ عقاب کو آشیاں بنانے کا ہُنر ہی نہیں آتا۔ یہ ایسا اڈّہ چنتا ہے جو کسی چٹان کی کھوہ سے باہر کو نکلا ہوا ہو۔ جہاں قدرت نے دو تہائی کام تو پہلے سے کر رکھا ہوتا ہے۔ باقی کا ایک تہائی کام یہ پرندے خود ہی کر لیتے ہیں۔ اور یہ صرف درختوں کی ٹہنیاں، پتے اور گھاس کے پُولے باہم جوڑنے کا کام ہوتا ہے۔ جس سے ایک کھردرا سا بستر تیار ہو جاتا ہے۔ جس پر انڈے دیئے جا سکیں اور بیٹھے جا سکیں۔

یہ سب تفاصیل ہمیں تب معلوم ہوئیں جب ہم اپنے چھپنے کی جگہ سے رینگ کر باہر نکلے۔ اور ہم نے دوسری بار عقاب کے گھونسلے کا دُور سے جائزہ لیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دونوں عقاب بچے جو اب بڑھ کر بڑے عقاب بن چکے تھے اور ان کی ماں بھی، ہمارے پرانے دوست تھے۔ حالانکہ یہ بچے اب بڑے ہو چکے تھے پھر بھی عادتاً ان کی ماں اپنے پنجے اندر سکیڑ لیتی تھی تاکہ اس کے بچے ان پنجوں سے زخمی نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ عمل عارضی ہوتا تھا۔ جب اُسے اس بات کا اطمینان ہو جاتا کہ وہ اسے ملنے کے لیے دوڑ کر آ رہے ہیں تو وہ اپنے پنجے کھول کر مضبوطی

سے بیرونی اڈّے پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ عقاب بچے، اگرچہ اب جبکہ وہ مکمّل عقاب بن چکے تھے انہیں بچے نہیں کہنا چاہئے' دوڑتے ہوئے آگے آتے تھے اور اپنی ماں کے پوری طرح کھلے ہوئے پنکھوں کے نیچے پناہ لیتے تھے۔ لیکن یہ چھوٹے جانور زیادہ دیر تک ماں کی گود میں نہیں ٹکتے تھے' وہ اس وقت پیار چمکار بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو بھوکے ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں کچھ کھلایا جائے۔ لیکن افسوس ماں ان کے کھانے کے لیے کچھ نہیں لائی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ ماں کے پاس سے ہٹ جاتے اور کھانے کے انتظار میں پھر سے ہوا کے مقابل بیٹھ جاتے تھے۔

گھونڈ کا اشارہ پا کر ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور چڑھائی شروع کر دی۔ چھپکلی کی سی خاموشی کے ساتھ رینگتے ہوئے ہم گھنٹے بھر میں عقاب کے گھونسلے کی چھت تک پہنچ پائے۔ جونہی میں اس چھت کے اوپر سے گزرا ہڈیوں اور خشک ہوتے ہوئے گوشت کی سڑانڈ میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ عقاب جو پرندوں کا بادشاہ ہے، ویسا صاف ستھرا پرندہ نہیں جتنا کہ کبوتر۔

جلد ہی ہم رنگیلے کے پاس پہنچ گئے اور اُسے پنجرے میں ڈالنے کی کوشش کی۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوش ہوا لیکن پنجرے میں آنے سے کترایا۔ چونکہ دیر ہو رہی تھی میں نے اُسے کچھ مسور کے دانے کھانے کے لیے دیئے۔ اس طعام کے درمیان جب وہ کھانے میں مست تھا میں نے اُسے اپنے ہاتھ سے دبوچنے کی کوشش کی۔ اس سے وہ بے چارہ ڈر گیا اور اڑ چلا۔ اُس کی اڑان کے شور کو سن کر ماں عقاب اپنے گھونسلے کے آرام گھر سے باہر آ گئی۔ اُس نے باہر دیکھا تو اس کی چونچ کانپ رہی تھی اور اُس کے پنکھ اڑنے کی تیاری میں تھے۔ یک لخت جنگل کا سارا شور و غل دب گیا اور عقاب ماں نے اڑان بھر لی۔ ہم نے سمجھ لیا کہ اب رنگیلے کے دن پورے ہو گئے۔ اچانک ایک پرچھائیں اس کے اوپر پڑی میں نے سوچا عقاب اس پر جھپٹ رہا ہے۔ تاہم یہ پرچھائیں لمحہ بھر اس پر ٹکی اور پھر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن رنگیلے نے اپنی زندگی کا بدترین خوف دیکھ لیا اور وہ حد درجہ دہشت کے مارے ٹیڑھی میڑھی اڑان کرتا ہوا کہیں دور چلا گیا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو

گیا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ ہم رنگیلا کو قطعاً کھو چکے ہیں۔لیکن گھونڈ کا اصرار تھا کہ ہم ایسا فرض کر لینے کے بجائے ایک دو دنوں میں اُسے پالیں گے۔لہٰذا ہم نے انتظار کرنے اور وہیں اپنا وقت گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

جلد ہی رات پڑ گئی اور ہم نے کچھ چیڑ کے درختوں کے نیچے پناہ لی۔اگلی صبح گھونڈ نے ہمیں بتایا کہ آج وہ دن آ گیا ہے جب عقاب بچے اڑنا شروع کریں گے۔آخر میں اس نے کہا عقاب اپنے بچوں کو اڑنا سکھانے کے لیے سبق نہیں دیتے۔انہیں پتہ ہوتا ہے کہ عقاب بچے کب اڑان بھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔تب ماں باپ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اُس پورے دن ہی عقاب بچوں کی ماں دوبارہ اپنے گھونسلے پر نہیں آئی جب رات ہوئی تو اس کے بچوں نے اُس کے واپس آنے کی امید بالکل چھوڑ دی اور وہ اپنے گھر کے اندرونی حصے میں لوٹ گئے۔ہمارے لیے یہ ایک یادگار رات ثابت ہوئی۔ہم اس قدر بلندی پر مقیم تھے کہ ہمیں یقین تھا ہم کو کسی شکاری درندے سے وہاں حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔شیر اور چیتے نیچے کی طرف چلے جاتے ہیں۔اس لیے نہیں کہ انہیں بلندی سے ڈر لگتا ہے بلکہ اس لیے کہ سبھی جانوروں کی طرح وہ اپنی خوراک کا پیچھا کرتے ہیں۔مرگ، ہرن، دریائی بھینس اور جنگلی سور وہاں پر چرتے ہیں جہاں وادیاں ہوتی ہیں اور جنگلی گھاس کی بہتات ہوتی ہے۔چونکہ یہ جانور وہاں چلے جاتے ہیں جہاں گھاس، پودے اور لذیذ ٹہنیاں ہوتی ہیں۔مختصر بات یہ کہ ان کی غذا دریاؤں کے کنارے اگتی ہے، تو جانور انہیں کھا کر گزارہ کرتے ہیں ان کی کھوج میں وہیں جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اونچے خطے کچھ پرندوں، جنگلی بلّیوں، اژدہوں اور برفانی تیندوؤں کو چھوڑ کر باقی شکاری درندوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ سُرا گائے جو گھریلو گائے کی جیسی ہوتی ہے اتنی بلندی تک نہیں چڑھتی۔یا زیادہ تعداد میں یا اکثر و بیشتر ان اونچائیوں تک نہیں پہنچتی۔کبھی کبھی ایک دو پہاڑی

بکریاں بیشک وہاں دکھائی دے جاتی ہیں۔لیکن اس سے بڑا کوئی جانور وہاں نہیں ہوتا۔لہٰذا ہماری رات کسی بھی ڈرامائی تجربے سے خالی رہی۔تاہم اس کی کمی بدن خراش سردی نے پوری کردی جس کی گرفت میں صبح سویرے کی گھڑیوں میں ہمارے جسم بری طرح کانپنے لگے۔نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔میں تو اٹھ کر بیٹھا رہا اور اپنے بستر کے سبھی کمبل اپنے بدن کے گرد اوڑھ کر غور سے دیکھتا اور سنتا رہا۔سناٹا بے حد گہرا تھا جیسے کسی ڈھول کی کھال کو اس قدر کس دیا گیا ہو کہ اُس پر سانس لینے سے بھی کراہ بلند ہو۔ہر طرف سے دلدوز خاموشی نے مجھے گھیر رکھا تھا۔کبھی کبھار کسی درخت کی ٹہنی سے کسی نرم رَو (سہل قدم) جنگلی بلّی کے کودنے سے پت جھڑ کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو ایسا لگتا جیسے کوئی دھماکہ ہوا ہے۔وہ آواز جلد ہی اس خاموشی کے مسلسل بڑھتے ہوئے سیلاب میں ایک پتھر کی طرح ڈوب جاتی۔ستارے بھی رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے ڈوب گئے۔پُراسرار سناٹے کا بڑھتا ہوا سیلاب جو ہر شے پر مسلّط تھا ختم ہونے لگا۔عقاب کے گھونسلے میں کوئی چیز ایسے کپکپائی جیسے نیزے باہم ٹکرائے ہوں۔اس میں شبہ نہیں تھا کہ اب دن نکل رہا ہے اب پھر وہی آواز اُسی جگہ سے سنائی دی۔عقاب اپنے پنکھوں کو اپنی چونچوں سے سہلا رہے تھے جیسے انسان نیند سے پوری طرح جاگنے سے پہلے اپنے جسم کو پھیلا کر انگڑائی لیتا ہے۔مجھے نزدیک ہی سرسراہٹ سنائی دی میں سمجھا کی دونوں عقاب اپنے گھونسلے کے بیرونی اڈّے پر آرہے ہیں۔جلد ہی دوسری آوازیں سنائی دینے لگیں۔سارس ہمارے اوپر سے اڑتے ہوئے گزر گئے۔سارسوں جیسے ہی انوکھے پنچھیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔قریب ہی ایک سُرا گائے کی ہُنکار نے سناٹے کو چیر دیا۔ایسا لگا جیسے اس نے اپنا سینگ کسی ڈھول کی چمڑی میں گاڑ دیا ہو۔دُور نیچے پرندے ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔آخر کار کنچن جنگا کے سلسلۂ کوہ پر روشنی پڑی۔پھر مکالو کی چوٹی اپنے سر کی پشت پر سفید پولکی پتھر کا چمکدار ہالہ لیے ہوئے دکھائی پڑی۔پھر ماؤنٹ بلینک جتنی بلندی والے کچھ نچلے پہاڑی سلسلے اپنی دودھیا شان و شوکت کی پوشاک پہنے نظر آئے۔چٹانوں اور درختوں کی شکلیں اور رنگ نگاہوں پر نمایاں ہوئے۔آرکِڈ کے پھول صبح کی اوس پڑنے سے

کپکپانے لگے۔اب سورج کسی شیر کی طرح جست لگا کرآسمان کے کندھے پرآن چڑھااور برف
کے بُرج والے اُفق سے گلنارآگ کا رنگ بہہ چلا۔

گھونڈ اور رادجا جواب جاگ چکے تھے کھڑے ہو گئے۔ پھر رادجا نے جو بخوبی تربیت
یافتہ پجاری تھا''سویتر''یعنی سورج دیوتا کی حمد میں ویدوں کے سنسکرت منتروں کا اُچارن کیا۔

اے مشرقی سکوت کے پھول!

چلتا چل اپنے قدیمی راستے پر جس پر انسان کے قدم ابھی تک نہیں پڑے

اپنے پُراسرار، بے گردوغبار جادے پر گامزن رہ

اورتُو خداوندتعالٰی کے سنہری سنگھاسن تک پہنچ جا

اوراس کے حضور میں ہماری شفاعت کر

اُس کی خاموشی کے روبرواور رحمت بھری بے کلامی کے آگے۔

ہماری اس تلاوت سے عقاب ڈر گئے چونکہ وہ انسان کی آواز کے عادی نہیں تھے۔
لیکن اس سے پہلے وہ برانگیختہ ہوکر طیش میں آجاتے ہم پست قد چیڑ کے پیڑ کے نیچے چھپ گئے۔
ان عقابوں نے جنہیں کوئی ناشتہ نہیں ملا تھا، باہر نظر دوڑائی اور آسمان میں تجسّس بھری نگاہ ڈالی کہ
کہیں ان کے ماں باپ کا نام ونشان ملے۔ پھر انہوں نے نیچے ٹکٹکی لگا کر دیکھا جہاں طوطوں اور
نیل کنٹھوں کے غول کے غول اڑتے ہوئے ایسے نظر آتے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے گنگناتے
پرندے ہوں۔ جنگلی کل ہنس جنہوں نے جنوبی علاقوں کی جانب سفر کرتے ہوئے اپنی رات برفانی
چوٹیوں پر گزاری تھی ان چوٹیوں کے اوپر سے گھسٹتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ وہ بھی چند منٹوں میں دُور
جا کر گوبریلے (بھنورے) جتنے چھوٹے لگنے لگے اور خلا میں غائب ہو گئے۔ کئی گھنٹے گزر گئے لیکن
بڑے عقاب کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آیا۔ ان نوخیز عقابوں کو اب بھوک نے اور زیادہ ستایا وہ
اپنے گھونسلے میں بے چین ہونے لگے۔ ہمیں گھونسلے کے اندر سے باہم جھگڑنے کی آوازیں سنائی
دینے لگیں۔ جن کی شدت اور شور لگاتار بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک گھر چھوڑ کر

چٹان پر چڑھنے لگا۔ وہ اپنے پروں کو استعمال کئے بغیر اوراونچا اوراونچا چلتا گیا۔ اب دوپہر بیت
رہی تھی۔ ہم نے دوپہر کا کھانا کھالیا۔ پھر بھی ابھی تک عقابوں کے ماں باپ کا کوئی نام ونشان نظر
نہ آیا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ جو عقاب گھونسلے میں اکیلا چھوٹ گیا ہے وہ دوسرے کی بہن ہے چونکہ وہ
دوسرے عقاب سے کچھ چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ ہوا کے مقابل بیٹھی تھی اور دور نظریں جمائے ٹکٹکی
باندھ کر دیکھے جارہی تھی لیکن جلد ہی وہ دل شکستہ ہوگئی۔ اگر چہ یہ کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ میں
نے ابھی تک کوئی ہمالیائی عقاب ایسا نہیں دیکھا جو اپنی پیدائش ہی کے وقت سے ہوا کے بالمقابل
نہ بیٹھا ہو تاوقتیکہ وہ اڑنا سیکھ لے۔ بالکل اس طرح جیسے کسی جہاز ران کا بیٹا سمندر پر نگاہ جمائے
رکھتا ہے جب تک کہ وہ خود جہاز چلانا سیکھ نہیں لیتا۔ دو بجے بعد دوپہر وہ مادہ عقاب بھی گھونسلے میں
انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی جواب بہت دور اونچائی پر
چٹان کی چوٹی پر جا بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہوا کے سامنے کے رخ پر ہی بیٹھا تھا۔ جب اس کی بہن بھی چل
کر اوپر اس تک پہنچ گئی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اب اسے خوشی تھی کہ وہ اکیلا نہیں۔ بہن کو
دیکھ کر اسے خوراک کی تلاش میں اکیلے اڑنے کے پُرملال خیال سے نجات مل گئی۔ میں نے کوئی
عقاب بچہ ایسا نہیں دیکھا جسے اس کے والدین اڑنا سکھا رہے ہوں۔ اسی لیے چھوٹے عقاب تب
تک اڑنے کے لیے پنکھ نہیں کھولتے جب تک بھوک انہیں مجبور نہ کردے۔ عقاب ماں باپ اس
بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور صحیح وقت
آجاتا ہے تو وہ انہیں اکیلے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چل دیتے ہیں۔

بڑی مشقت سے عقاب کی بہن نے چڑھائی چڑھی اور اپنے بھائی کے پہلو میں پہنچ گئی
لیکن افسوس وہاں دو پرندوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ بجائے اس کے کہ دونوں اس اڈّے پر
توازن کے ساتھ بیٹھ جاتے، بہن کے وزن سے اس کے بھائی کو دھکّا لگا اور اس نے پنکھ پھلا
دیئے۔ ہوا نے اسے سہارا دیا۔ اس نے اپنے پنجے بھی کھول دیئے لیکن اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اس کے
پنجے زمین کو نہیں چھو سکتے تھے۔ اب تک وہ ہوا میں تقریباً دو فٹ اُچھل چکا تھا لہٰذا اُس نے اپنے

پنکھ پھڑ پھڑائے اور کچھ مزید اوپر اٹھ گیا۔ اُس نے تب اپنی دُم نیچے کو گھمائی جس نے پتوار کا کام کیا اور اُسے جھلا دیا، کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی مشرق کو اور کبھی جنوب کو تو پھر سے مشرق کی جانب۔ وہ ہمارے اوپر آکاش میں جھولتا رہا اور ہمیں اُس کے پنکھوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ اُسی پل ایک گمبھیر خاموشی ہر شے پر چھا گئی۔ کیڑوں مکوڑوں کا شور بند ہوگیا۔ خرگوش اگر واقعی وہاں تھے —— تو اپنے بلوں میں جا گھسے۔ جب یہ ہوا کا نیا حکمراں اونچا اور اونچا اڑنے لگا تو ایسا لگتا تھا کہ پتّے بھی خاموشی سے اُس کے پنکھوں کی دھمک کو سُن رہے ہیں۔ اُسے کافی دور تک اڑنا پڑا چونکہ بہت دور تک اڑان بھرنے سے ہی اُسے وہ چیز مل سکتی تھی جس کی اُسے طلب تھی۔ بعض مرتبہ تو عقاب اٹھارہ سو سے تین ہزار فٹ تک کی اونچائی سے نیچے زمین پر کسی خرگوش کو پھُدکتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ تب وہ اپنے پنکھ سمیٹ کر بجلی کی رفتار سے ہوا کو چیر کر گرجتا ہوا نیچے آتا ہے۔ اُس کے آنے کی ڈراؤنی آواز اُس کمزور جانور پر جادو سا اثر ڈال دیتی ہے۔ اور وہ اپنے دشمن کی آمد کی گرجدار آواز سُن کر وہیں بے حرکت ہو جاتا ہے۔ تب عقاب کے پنجے اُس کو پھاڑ ڈالتے ہیں۔

اپنے بھائی عقاب کو اس طرح ہوا میں دور جاتا دیکھ کر اور تنہائی سے خوف زدہ ہو کر بہن نے بھی یکا یک اپنے پنکھ پھُلا دیئے۔ نیچے چلتی ہوا نے اسے اوپر اچھال دیا۔ وہ بھی ہوا میں تیرنے لگی اور اپنی دُم کی مدد سے اپنی اڑان کا رُخ اپنے ساتھی کی طرف موڑ لیا۔ چند منٹوں میں وہ دونوں ہی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔ اب ان پہاڑوں سے روانہ ہونے اور اپنے کبوتر کی تلاش میں نکلنے کی ہماری باری تھی۔ ہوسکتا ہے وہ دین تام کو چلا گیا ہو۔ لیکن ہمارے لیے یہی مناسب تھا کہ ہم ہروہار میں اور جاگیردار کے قلعے میں اُس کو جا کر ڈھونڈھیں چونکہ انہی مقامات نے رنگیلے کی پچھلی اڑانوں کے دوران ایک رہنما مینار کا کام کیا تھا۔

رنگیلے کی کھوج میں

جب ہم نشیبی سنسان درّوں کی بھول بھلیوں میں اُترے تو ہم نے خود کو اچانک گہرے اندھیرے کی دنیا میں پایا حالانکہ اُس وقت مشکل سے دوپہر کے تین بجے تھے۔ یہ اندھیرا بلند چوٹیوں کے لمبے سایوں کی وجہ سے تھا جن کے نیچے ہم چل رہے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کی اور سرد ہوا نے ہمیں اور بھی مہمیز لگایا۔ جونہی لگ بھگ ایک ہزار فٹ یا اُس سے کچھ زیادہ اُتر چکے تو موسم مقابلتاً گرم تھا۔ لیکن رات نے تیزی سے ہمیں آلیا اور درجۂ حرارت پھر نیچے آگیا۔ لہٰذا ہمیں ایک بدھ وہار میں پناہ لینی پڑی۔ ہم اُسی خاص سرائے میں پہنچے جہاں بُدھ راہبوں نے (جو لاما کہلاتے ہیں) بڑی فیاضی سے ہماری مہمان نوازی کی تھی۔ انہوں نے صرف اس وقت ہمارے ساتھ بات کی جب ان کو ہمیں رات کا کھانا کھلانے اور ہمیں اپنے کمرے تک پہنچانے کا موقع ملا، کیونکہ وہ اپنی شامیں مراقبے میں گزارتے تھے۔

جہاں ہم ٹھہرے تھے وہ تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جو ایک پہاڑی کے پہلو کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ ان کے سامنے ایک سبزہ زار تھا جو گھرا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہمیں دکھائی دیا کہ ہمارے سونے کے لیے پتھریلے فرش پر صرف پوال بچھے ہوئے تھے۔ پھر بھی رات کسی طرح گزر گئی۔ ہم اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ ہمیں ہوش نہ تھا۔ ہم ایسے سو گئے جیسے بچے اپنی ماں کے

باز ووں میں سو جاتے ہیں۔ صبح تقریباً چار بجے میں نے قدموں کی آہٹ سنی، میں جاگ گیا۔ بستر سے اٹھا اور آوازوں کی سمت چل پڑا۔ جلد ہی مجھے تیز روشنیاں نظر آئیں۔ کچھ سیڑھیاں اتر کر اور پھر کچھ زینے اوپر چڑھ کر میں اس راہب گھر کے مرکزی عبادت خانے میں پہنچ گیا۔ یہ ایک وسیع گپھا تھی جو ایک باہر کو ابھری ہوئی چٹان کے نیچے بنی ہوئی تھی اور تین اطراف سے کھلی تھی۔ وہاں میرے سامنے آٹھ راہب (لاما) کھڑے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں۔ انہوں نے خاموشی سے اُسے ایک طرف رکھ دیا اور آلتی پالتی مار کر مراقبے میں بیٹھ گئے۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی ان کے گندمی چہروں اور نیلے چغوں پر پڑ رہی تھی اور اُن کے چہروں کے سکون اور پیار کو اُجاگر کر رہی تھی۔

اُن کے بکھیا نے مجھے اس وقت ہندوستانی بھاشا میں بتایا: ''ہمارا صدیوں سے یہ معمول رہا ہے کہ ہم سبھی سوئے ہوئے انسانوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ رات کے اس پہر میں وہ شخص بھی جسے بے خوابی کی بیماری ہو بے سُدھ ہو کر سو جاتا ہے اور چونکہ انسان جب نیند میں ہوتے ہیں اپنی آگہی قائم نہیں رکھ سکتے کہ خدا کی رحمت اُن کو پاکیزہ بنائے تاکہ جب وہ صبح کو جاگیں تو اپنا دِن ایسے خیالات کے ساتھ شروع کریں جو پاکیزہ، مہربانی بھرے اور دلیرانہ ہوں۔ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ دھیان لگائیں گے؟''

میں خوشی سے تیار ہو گیا۔ ہم نے تمام انسانیت کے لیے رحم دلی اور دردمندی کی دعا مانگی۔ آج بھی جب میں نیند میں بیدار ہوتا ہوں مجھے ہمالیہ کے اُن بدھ راہبوں کا خیال آتا ہے جو تمام سوئے ہوئے مردوں اور عورتوں کے خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لیے دعا کرتے تھے۔

جلد ہی سویرا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم ایک پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھے تھے اور ہمارے قدموں کے نیچے ایک سنگین عمودی ڈھلان تھی۔ چاندی کی گھنٹیوں کی جھنکار صبح کی دھوپ سے گرم ہوا میں دھیرے دھیرے گونجی۔ گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ یہ گھنٹیاں سونے اور چاندی کی تھیں۔ نرمی سے کھنکتی تھیں اور ہوا کو شیریں موسیقی سے بھر رہی تھیں۔ یہ راہبوں کی طرف سے روشنی کے پیغمبر

(سورج) کا خیر مقدم تھا۔ سورج اندھیرے پر روشنی کی فتح اور موت پر زندگی کی فتح کی شہنائی کی طرح طلوع ہوا۔

نیچے واپس آ کر میں ناشتے پر رادؔجا اور گھونڈ سے ملا۔ اُسی موقعے پر ایک بھکشو نے جو ہمیں ناشتہ کروا رہا تھا، بتایا: ''تمہارا کبوتر کل یہاں پناہ لینے آیا تھا۔'' اُس نے رنگیلے کا حلیہ بھی ہو بہو بتایا۔ یہاں تک کہ اُس کی ناک کی ڈنڈی، اُس کے قد اور رنگ بھی۔

گھونڈ نے پوچھا: ''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم کبوتر کی تلاش میں ہیں؟''

سپاٹ چہرے والے لاما نے آنکھ کی پتلی کو گھمائے بغیر ہی جواب دیا۔ ''میں آپ کے خیالات کو پڑھ سکتا ہوں۔''

رادؔجا نے اشتیاق سے سوال کیا۔ ''آپ ہماری سوچوں کو کیسے جان سکتے ہیں؟''

بھکشو نے جواب دیا۔ ''اگر آپ دن میں چار گھنٹے ابدی ذاتِ رحمانی سے سبھی جانداروں کے لیے سُکھ کی دعا کریں تو بارہ برسوں کے عرصے میں وہ ذاتِ الٰہی آپ کو یہ قوت عطا کر دیتی ہے کہ آپ کچھ لوگوں کے خیالات پڑھ سکیں خصوصاً ان لوگوں کے خیالات جو یہاں پر آتے ہیں...... جب آپ کے کبوتر نے ہمارے یہاں پناہ لی تو ہم نے اُس کو کھانا دیا اور اُس کے خوف سے اُسے چھٹکارا دلایا۔''

میں حیرت سے بول اٹھا ''خوف سے چھٹکارا؟ یا میرے خدا!

لاما نے بڑی سادگی سے میری بات کی تائید کی ''ہاں وہ بری طرح ڈرا ہوا تھا چنانچہ میں نے اُسے اپنے ہاتھ میں تھام کر اُس کے سر کو سہلایا اور اُسے کہا کہ وہ ڈرے نہیں۔ تب کل صبح میں نے اُسے جانے دیا۔ اُسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔''

''سوامی! آپ کیسے ہمیں یہ بات کہہ سکتے ہیں اس کا کچھ تو سبب ہوگا؟'' گھونڈ نے عاجزی سے دریافت کیا۔ اُس مردِ خدا نے اُسے اس طرح جواب دیا۔ ''اے شکاریوں کے ہیرے! آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ کسی بھی جانور پر اور نہ ہی کسی انسان پر کوئی دُشمن حملہ کرتا

ہے اور اُسے ہلاک کرتا ہے جب تک وہ حملہ آور اُسے ڈرانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ میں نے تو کئی خرگوش دیکھے ہیں جو شکاری کتوں اور لومڑیوں سے بچ نکلے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اُن لوگوں نے خود کو خوف زدہ نہیں ہونے دیا۔ خوف ہی انسان کے ہوش و حواس دھندلا دیتا ہے اور اس کے حوصلے کو مفلوج کر دیتا ہے۔ جو جاندار خود کو خوفزدہ ہونے دیتا ہے وہی خود کو ہلاک کرواتا ہے۔"

"لیکن میرے آقا آپ کسی پرندے کے خوف کا علاج کیسے کر لیتے ہیں؟"

رادجا کے اس سوال کا جواب اُس پاکیزہ ہستی نے یوں دیا۔ "اگر آپ کو کوئی خوف نہیں اور آپ کئی مہینوں تک نہ صرف اپنے خیالات پاکیزہ رکھیں بلکہ اپنی نیند کو بھی ڈراؤنے خوابوں سے پاک رکھیں تب آپ جس شے کو بھی چھوئیں گے وہ نڈر اور بے خوف ہو جائے گی۔ اب آپ کا کبوتر نڈر ہو چکا ہے چونکہ میں، جس نے اُسے ہاتھ میں تھاما تھا لگ بھگ بیس برسوں سے اپنے خیالات عمل اور خوابوں میں کبھی خوفزدہ نہیں رہا۔ اِس وقت آپ کا پالتو پرندہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

اعتقاد سے بھرے اس کے الفاظ سے جو اُس نے بغیر کسی تاکید کے کہے، میں نے محسوس کیا کہ سچ مُچ رنگیلا اب صحیح سلامت ہے۔ مزید وقت ضائع نہ کرنے کے ارادے سے میں نے مہاتما بدھ کے اِن پیروکاروں سے اجازت لی اور جنوب کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں یہ بتا دوں مجھے پختہ یقین تھا کہ لاما لوگ بالکل سچے تھے۔ اگر آپ صبح اُٹھ کر دوسروں کے لیے دعا مانگیں تو آپ اپنا دِن پاکیزہ خیالات، حوصلہ مندی اور پیار کے ساتھ شروع کرنے کے لائق بنا دیتے ہیں۔

اب ہم تیزی سے دین تام کی جانب اترنے لگے۔ ہمارا راستہ اب ایسے مقامات سے گزرتا تھا جو زیادہ گرم تھے اور جانے پہچانے بھی۔ اب ہمیں راستے میں براس کے پھول کہیں نظر نہیں آئے۔ خزاں کی وہ رت جس نے دُور اوپر پہاڑی خطّہ میں پیڑوں کے پتوں کو چھو کر ارغوانی، سنہری اور گلنار رنگ میں رنگا تھا، ابھی یہاں زیادہ پیش رفت نہ کر پائی تھی۔ چیری کے

پیڑوں پر اب بھی پھل لگے ہوئے تھے۔ درختوں پر موٹی کائی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ہوا نے ان پر آرکِڈ کے ان پھولوں کے پراگ اڑا کر بکھیر دیئے تھے جو کھل کر پورے ہاتھ کی ہتھیلی جتنے بڑے بڑے اور جامنی اور گہرے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہت سے سفید دھتورے کے پھولوں پر شبنم کی بوندیں ایسے لگ رہی تھیں جیسے سورج کی بھاپ دینے والی حرارت سے ان پھولوں کو پسینہ آرہا ہو۔ درخت اب زیادہ اونچے اور ڈراونے لگ رہے تھے۔ بانس کے پیڑ آسمان شگاف میناروں کی طرح اوپر کو لپک رہے تھے۔ جھینگروں کی بھنبھناہٹ مسلسل بڑھ رہی تھی اور ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی اور جنگل میں نیل کنٹھ بڑبڑا رہے تھے۔ گاہے گاہے سبز رنگ کے طوطوں کا کوئی جھنڈ سورج کے سامنے اپنی زمرّدی شوکت دکھلاتا اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ کیڑے مکوڑے بڑھتے جا رہے تھے۔ مخملی سیاہ رنگ کی بڑی بڑی تتلیاں ایک پھول سے دوسرے پھول پر ٹولیوں میں اڈ پڑتی تھیں اور بے شمار پرندے ان گنت بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو اپنا نوالہ بنا رہے تھے۔ کیڑے مکوڑے ہمیں اپنے تیکھے سے تیکھے ڈنک مار رہے تھے اور کبھی کبھی تو ہمیں اپنے راستے سے گزرنے والے سانپ کے گزر جانے تک انتظار میں رُکنا پڑتا تھا۔ اگر گھونڈو کی تجربہ کار آنکھوں کی رہنمائی نہ ہوتی تو ہمیں اب تک کسی سانپ نے یا جنگلی بھینسے نے دس بار مار ڈالا ہوتا۔ اُسے معلوم تھا کہ جانور کدھر سے آتے ہیں اور کس سمت کو جاتے ہیں۔ گھونڈا اپنے کان زمین سے لگاتا اور غور سے سنتا تھا۔ کچھ منٹوں کے بعد وہ بتاتا کہ ہمارے آگے سے جنگلی بھینس آ رہی ہے۔ جب تک وہ گزر جائیں ہمیں رُک جانا چاہئے۔ اور جلد ہی ہم گھاس پر سے ان کے نوکیلے سُموں کے ساتھ گزرنے کا ناگوار شور سنتے۔ ایسا لگتا جیسے کوئی ہنسیا ہمارے قدموں کے نیچے سے لگاتار زمین کاٹ رہی ہو۔ پھر بھی ہم رواں دواں رہے۔ بس صرف ہم دوپہر کے کھانے کے لیے نصف گھنٹہ رُکے۔ آخر کار ہم سکّم کی سرحد پر پہنچ گئے جہاں کی چھوٹی سی وادی سرخ باجرے کی فصل، سنگتروں، سنہری کیلوں سے جھلملا رہی تھی اور اُس کے سامنے پہاڑی ڈھلانوں کے دامن میں گیندے کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

عین اُسی وقت ہم نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جسے میں کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔ ہمارے قدموں میں قافلوں کی تنگ گزرگاہ پر ہوا تپ کر رنگ برنگی ہو رہی تھی۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ ہوا میں رنگ لہراتے تھے۔ ابھی ہم مشکل سے چند گز ہی چل پائے تھے کہ ہمالیائی تیتروں کا ایک کثیر جھنڈ بجلی کے کوندے کی طرح سامنے سے اُٹھا اور اڑتا ہوا جنگل کی جانب چلا گیا۔ ان کے پنکھ گرم ہوا میں مور کے بال و پر کی طرح کوندتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم چلتے گئے۔ اگلے دو منٹوں میں ایک اور جھنڈ نمودار ہوا لیکن یہ مٹیالے رنگ کے پرندے تھے۔ اپنی حیرانی کے عالم میں میں نے گھونڈ سے ان کی تفصیل چاہی۔

اُس نے کہا۔ ”اے اقبال و سعادت کے محبوب! کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ یہ قافلہ جو ابھی یہاں سے گزرا ہے وہ باجرہ لاد کر لے جا رہا تھا۔ ان کی ایک بوری میں چھید تھا۔ بوری کے دوبارہ بٹے جانے سے پہلے ہی چند مُٹھی باجرہ اس سوراخ میں سے گر کر سڑک پر بکھر گیا۔ اس کے بعد یہ پرندے یہاں پہنچ گئے اور انہوں نے اِسے یہاں کھایا۔ ہم اچانک ان کے قریب پہنچ گئے اور وہ ڈر کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

میں نے دریافت کیا ”لیکن اے عقل مند دوست اِن میں نر پرندے کیوں اتنے آب و تاب والے دکھائی دیتے ہیں اور مادہ پرندے مٹیالے رنگ کے ہیں؟ کیا فطرت ہمیشہ نر صنف کی طرفداری کرتی ہے؟“

گھونڈ نے اس کی حسبِ ذیل وضاحت کی ”کہا جاتا ہے کہ قدرت نے سبھی پرندوں کو ایسے رنگ عطا کئے ہیں جو ان کے دشمنوں کی نظر سے ان کو چھپا سکیں۔ لیکن تم کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ تیتر اتنی چمک دمک والے ہیں کہ وہ صاف نظر آ جاتے ہیں اور ایک اندھا بھی انہیں مار سکتا ہے۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ راد جا نے حیرت سے سوال کیا۔

”اے اپنی عمر سے زیادہ ہوشیار لڑکے! ایسا نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ درختوں پر رہتے ہیں اور جب تک زمین بہت گرم نہ ہو جائے وہ نیچے نہیں اترتے۔ ہمارے اس

گرم دیش بھارت میں دھرتی سے دو انچ اوپر تک کی ہوا اتنی تپش والی ہوتی ہے کہ اس میں ہزاروں رنگ تھرتھراتے ہیں اور تیتر کے بال و پر بھی اسی جیسے رنگ برنگے ہوتے ہیں۔ جب ہم ان کی جانب دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ پرندے نظر نہیں آتے بلکہ رنگ برنگی ہوا دکھائی دیتی ہے جو ان کو پوری ہنرمندی سے چھپا دیتی ہے۔ چند منٹ پہلے ہم تو بالکل ان کے اوپر ہی قدم رکھنے والے تھے یہ سوچ کر کہ وہ ہمارے قدموں میں آنے والی سڑک کا ہی جزو ہیں۔“

”جی میں سمجھ گیا“ راد جا نے تعظیم سے کہا ”لیکن مادہ تیتریں کیوں مٹیالے رنگ کی دکھائی دیتی تھیں اور وہ اپنے نر تیتروں کے ساتھ کیوں نہیں اڑتی تھیں؟“

گھونڈ نے بلا تامل جواب دیا۔ ”جب دشمن ان تک اچانک پہنچ کر ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو نر تیتر دشمن کی گولی کا مقابلہ کرنے کے لیے اوپر اڑ جاتا ہے اگرچہ وہ ایسا بہادری دکھانے کے لیے نہیں کرتا۔ مادہ تیتر کے پر زیادہ اچھے نہیں ہوتے اس کے علاوہ اس کا رنگ زمین کے رنگ جیسا ہوتا ہے وہ اپنے پنکھ کھول کر ان کے نیچے اپنے بچوں کو پناہ دیتی ہے اور پھر زمین پر چت لیٹ جاتی ہے اس طرح کہ اپنے وجود کو زمین کے ساتھ ہم رنگ کر کے رنگوں کے اس سلسلے میں گھل جاتی ہے۔ جب دشمن ان مادہ تیتروں کے شوہروں کی، جو لگ بھگ ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں، لاشوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے تو مادہ تیتریاں اپنے ننھے بچوں کو لے کر سب سے قریب واقع جنگل میں بھاگ جاتی ہیں۔ اگر یہ سال کا بالکل آخری حصہ نہ ہو تو اُن کے پالے پوسے ہوئے جوان بچے ان کے ہمراہ نہیں ہوتے تو ماں تیتریاں چت ہو جاتی ہیں اور اپنے بچوں کی حفاظت کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔ اپنی قربانی دینا ان کی فطرت بن جاتی ہے اور عادتاً وہ اپنے پنکھ آگے پھیلا دیتی ہیں۔ چاہے ان کے ہمراہ ان کے بچے ہوں یا نہ ہوں۔ جب ہم اچانک ان تک پہنچے تو وہ یہی کر رہی تھیں۔ تب اچانک انہیں خیال آیا کہ ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں جس کی انہیں حفاظت کرنی ہو۔ اور چونکہ ہم مسلسل ان کے قریب آ رہے تھے انہوں نے اڑان بھر لی، اگرچہ وہ اڑنے میں تیز نہیں ہوتیں۔“

شام ڈھلنے لگی تھی لہٰذا ہم نے ایک سکّھی رئیس کے گھر پناہ لی جس کا بیٹا ہمارا دوست تھا۔

وہاں ہمیں رنگیلے کے بارے میں مزید سراغ ملے جوان کے گھر پہلے بھی کئی بار جا چکا تھا۔ چنانچہ اب وہ اپنی اس تازہ ترین اڑان میں اپنی جانی پہچانی جگہ پر پہنچا تو یہاں اس نے باجرے کے دانے کھائے، پانی پیا اور غسل کیا تھا۔ یہاں اُس نے اپنی چونچ سے اپنے بال و پر بھی سنوارے اور اپنے دو چھوٹے چھوٹے نیلگوں پر بھی چھوڑے تھے جنہیں میرے دوست نے ان پر رنگ چڑھانے کے ارادے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جب میں نے وہ پر دیکھے تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور میں اُس رات مکمل سکون اور اطمینان کے ساتھ سویا۔ جی بھر کر سونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ گھونڈ نے ہمیں گہری نیند لینے کی ہدایت کی تھی چونکہ اگلے دن کے پیدل سفر کے بعد ہمیں رات جنگل میں گزارنی تھی۔ اگلی رات جب ہم جنگل میں اسی درخت کی چوٹی پر بیٹھے تھے مجھے اکثر اپنے سکھی دوست کے گھر اور اس کی راحتوں کی یاد آتی رہی۔

تصور کیجیے کہ آپ سارا دن پیدل چلتے رہے ہوں اور اُس کے بعد آپ کو رات ایک خطرناک جنگل کے بیچ گزارنی پڑے۔ اس درخت کو ڈھونڈھنے میں ہی ہمیں آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت لگا چونکہ برگد کا درخت بیشتر بلندی پر نہیں اگتا۔ اور پھر اسی مقصد کے لیے جس کی خاطر ہم نے برگد ہی ڈھونڈا، ہمیں پیڑ بھی لمبا چوڑا ڈھونڈھنا پڑا۔ اگر یہ پتلا اور کمزور ہوتا تو ہمارے لیے بیکار ہوتا۔ کوئی ہاتھی ایسے پیڑ کی طرف اپنے پیچھے کو چل کر بھی اسے توڑ سکتا تھا۔ یہ موٹی چمڑی والا ہاتھی اس طرح کئی بڑے بڑے مضبوط درختوں کو گرا دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کرنا پڑا جو اس قدر اونچا ہو اور پختہ بھی کہ کسی ہاتھی کی سونڈ اس کی بالائی ٹہنیوں تک نہ پہنچ سکے، بلکہ دو ہاتھی دوہرے وزن سے دھکیل کر بھی اسے نہ توڑ سکیں۔

آخر کار ہم نے اپنی پسند کا ایسا درخت ڈھونڈھ ہی لیا۔ رادجا گھونڈ کے کاندھوں پر کھڑا ہو گیا اور میں رادجا کے کاندھوں پر یہاں تک کہ ہم اتنی اونچی ڈالیوں پر پہنچ گئے جو ایک انسان کے دھڑ جتنی موٹی ہوں۔ میں ان میں سے ایک پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اُس پر سے اپنی رسّی والی سیڑھی لٹکا دی جو ہمیں جنگل میں کسی بھی ناگہانی ضرورت کے لیے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنی پڑتی تھی جیسی کہ آج

ضرورت پیش آئی تھی۔ رادجا بھی اس کے ذریعہ اوپر چڑھ آیا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔ تب گھونڈ اس ٹہنی پر چڑھا اور ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اب ہم نے دیکھا کہ ہمارے نیچے جہاں گھونڈ کھڑا تھا وہاں نہ صرف اتنا اندھیرا چھا چکا تھا جتنا کوئلے کی کان میں ہوتا ہے، بلکہ وہاں دو سبز روشنیاں ایک دوسرے کے بالکل قریب چمک رہی تھیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ روشنیاں کس کی تھیں۔ گھونڈ نے خوشی بھرے لہجے میں کہا، ''اگر مجھے نیچے دو منٹ کی مزید دیر ہوئی ہوتی تو اس دھاری دار جانور نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا۔''

یہ دیکھ کر کہ اس کا شکار اس کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا، شیر نے ایک گرجدار دہاڑ لگائی جو ہوا کو ایک بددعا کی طرح تازیانہ لگا گئی۔ فوراً ماحول میں ایک تناؤ بھرا سناٹا چھا گیا۔ سبھی کیڑے مکوڑوں اور حیوانات کا جیسے گلا گھٹ گیا۔ اور یہ خاموشی مزید نیچے تک گہری اتر کر زمین میں سما گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے درختوں کی جڑوں تک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔

ہم نے اپنی نشست پر خود کو محفوظ کر لیا اور گھونڈ نے ہمارے پوری طرح لچکیلے رسّی کے زینے کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا، پھر اُسے رادجا کی اور پھر میری کمر کے ساتھ لپیٹ کر اس کا باقی حصّہ درخت کے مرکزی تنے کے گرد باندھ دیا۔ ہم نے اس کے ساتھ باری باری لٹک کر یہ آزمائش بھی کر لی کہ ایک بار یہ ہم میں سے ہر ایک کا وزن برداشت کر سکتا ہے۔ ایسا ہمیں اس لیے کرنا پڑا کہ ہم میں سے کوئی نیند کی وجہ سے پھسل کر نیچے جنگل میں نہ گر جائے۔ چونکہ آخر تو نیند میں آدمی کا جسم اس قدر ڈھیلا پڑ جاتا ہے کہ پتھر کی طرح نیچے گر پڑتا ہے۔ سب سے آخر میں گھونڈ نے اپنے ہتھیار اس طرح ترتیب سے رکھ دیئے کہ اگر نیند آ جائے تو یہ ہمارے لیے تکئے کا کام دے سکیں۔

اب جبکہ ہم سبھی انتظامات کر چکے تو ہم نے اپنی توجہ نیچے ہونے والی حرکات پر مرکوز کر دی۔ شیر اب ہمارے پیڑ کے نیچے سے چلا گیا تھا۔ کیڑوں مکوڑوں نے اپنا راگ الاپنا پھر سے شروع کر دیا تھا جو بار بار کچھ پلوں کے لیے اس وقت تھم جاتا تھا جب دور دراز کے درختوں سے

کوئی بھاری جسم ہلکے جھٹکے کے ساتھ نیچے گرتا تھا۔ یہ تیندوے اور چیتے تھے جو دن بھر پیڑوں پر سوتے رہتے اور رات کے وقت شکار کے لیے نیچے کودتے رہتے تھے۔

جب وہ چلے جاتے تھے تو مینڈک ٹرّانے لگتے۔ کیڑے مکوڑے بھی لگاتار بھنبھناتے اور اُلّو بھی ہوکتے تھے۔ شور ہیروں کی مانند اپنے لاکھوں رنگ پیش کرتا تھا۔ آوازیں ہماری سماعت پر ایسے جھپٹتی تھیں جیسے ننگی آنکھوں پر سورج کی روشنی کوندتی ہے۔ ایک جنگلی سؤر اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو توڑتا پھوڑتا ہوا گزرا۔ تب فوراً مینڈکوں نے ٹرّانا بند کر دیا اور کافی نیچے کہیں جنگل کی دھرتی پر لمبی گھاس اور دوسری جھاڑ جھنکار کو ایک مخروطی ڈھیر کی طرح اوپر اٹھنے اور پھر ایک گہری سانس کی آواز کے ساتھ اس کے نیچے واپس بیٹھنے کی آواز سنائی دی۔ سمندری لہروں کی بوچھار کے بل کھانے جیسی وہ کریہہ گہری سانس کی آواز ہمارے قریب اور قریب آتی جا رہی تھی۔ تب......
دھیرے دھیرے وہ ہمارے پیڑ کے پاس سے گزری۔ آہ! تب جان میں جان آئی۔ یہ ایک اجگر تھا جو پانی کے چشمے کی طرف جا رہا تھا۔ ہم اپنے پیڑ پر اس طرح خاموش بیٹھے رہے جیسے اس پیڑ کی چھال۔ گھونٹو کو ڈر تھا کہ کہیں ہماری سانس اُس خوفناک اژدہے کے لیے تم لوگوں کی موجودگی کا انکشاف نہ کر دے۔

چند منٹ بعد ہم نے ایک دو چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنی یہ اتنی مدھم سی تھی جیسے کوئی آدمی اپنی اپنی انگلیاں چٹخا رہا ہو۔ یہ ایک بارہ سینگا تھا جس کے سینگ کسی بیل میں الجھ گئے تھے اور وہ ان کو چھڑانے کے لیے ان بیلوں کو توڑ رہا تھا۔ ابھی مشکل سے وہ گزرا ہی تھا کہ جنگل کسی سانحہ کے خوف سے پھر بھر گیا۔ آوازیں پھر خاموش ہونے لگیں۔ دس بارہ مختلف قسم کے شور جو دفعتاً ہمارے کانوں میں ایک ساتھ پڑے تھے، اب ان میں سے محض تین ہی سنائی دے رہے تھے، کیڑوں مکوڑوں کی ٹک ٹک اور بارہ سینگے کی چھوٹی سی چیخ۔ اس میں شک نہیں کہ پانی کے چشمے کے پاس اجگر بارہ سنگے کا دم گھونٹ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اوپر ہوا کی سائیں سائیں کی آواز تھی۔ اب ہاتھی آ رہے تھے۔ یہ کوئی پچاس ہاتھیوں کا غول تھا۔ جو آ کر ہمارے نیچے کی جگہ اور

اس کے ارد گرد کھیلنے لگے۔ ہوا ہتھنیوں کی چلّاہٹ، ہاتھیوں کی ہنکار اور ان کے بچوں کی بھاگ دوڑ کی آوازوں سے بھر گئی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا چونکہ نیم بیداری کی حالت میں کچھ اونگھ سا گیا اور اس عالم میں مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں کبوتروں کی بولی میں رنگیلا سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں نیند اور خواب کی ملی جلی ایک گہری بدحواسی کی کیفیت سے گزر رہا تھا تو مجھے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا جب گھونٹو نے سرگوشی میں مجھ سے کہا ''اب میں زیادہ دیر تمہیں سہارا نہیں دے سکتا اب جاگ جاؤ مصیبت سامنے کھڑی ہے۔ ایک پاگل ہاتھی پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ وہ آوارہ گرد ہمیں ضرر پہنچانے پر آمادہ ہے۔ ہم اتنی زیادہ اونچائی پر نہیں ہیں کہ اس کی سونڈ کی پہنچ سے قطعاً محفوظ ہوں اور اگر اس نے اپنی سونڈ زیادہ اوپر تک اٹھائی تو سونگھنے سے ہی اسے ہماری موجودگی کا پتہ چل جائے گا۔ جنگلی ہاتھی انسان سے نفرت کرتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں۔ اور ایک بار اگر اس نے ہماری بو سونگھ لی تو وہ ہمارے ٹھکانے کا پتہ لگانے کے لیے دن بھر یہیں رُک سکتا ہے تو لڑکے! ذرا ہوش میں آ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ دشمن وار کرے اپنے ہتھیار سونت لو۔''

اُس ہاتھی سے متعلق وہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ صبحِ کاذب کی زرد روشنی میں مجھے ایک سیاہ پہاڑ سا ہمارے پیڑ کے نیچے ادھر ادھر حرکت کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک جاتا اور کچھ رسیلی ٹہنیاں توڑ لیتا تھا جنہیں پت جھڑ نے ابھی تک مرجھایا نہیں تھا۔ وہ لالچی لگ رہا تھا اور ان لذیذ شاخوں سے ناک تک اپنا پیٹ بھرنا چاہتا تھا جو سال کے اس حصے میں کمیاب ہوتی ہیں۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اس نے ایک عجیب کرتب کیا۔ اس نے اپنے پاؤں ایک موٹے سے پیڑ کے تنے پر ٹکا کر اپنی سونڈ اوپر جھلائی۔ اس عمل سے وہ ایک وسیع قد کا جسیم ہاتھی دکھائی دینے لگا۔ اپنی اس لمبی رسائی سے اس نے ایک پیڑ کی چوٹی کو چھو لیا اور اُس کی ٹہنی سے بہت سی خوش ذائقہ شاخوں کو توڑ لیا۔ اس کی عمدہ عمدہ ٹہنیاں توڑ کر اور اس پیڑ کو ننگا کر کے وہ ایک اور پیڑ کی طرف آیا جو ہمارے درخت سے اگلا درخت تھا۔ وہاں بھی اس نے یہی کارروائی دوہرائی۔ پھر اُسے ایک

نازک سا پیڑ نظر آیا جسے اس نے اپنی سونڈ سے نیچے کو جھکا لیا اور اور اپنے اگلے پاؤں اُس جھکے ہوئے پیڑ پر رکھ کر ایک دھڑاکے کے ساتھ اپنے وزن سے توڑ ڈالا۔ اس پیڑ سے جتنا کچھ وہ کھا سکتا تھا کھایا۔ جب وہ اس طرح ناشتہ کر رہا تھا اس کی غارت گری سے پرندے ڈر کے مارے ہوا میں اڑنے لگے اور بندر ڈر کر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کودتے ہوئے چٹر پٹر کرنے لگے۔ تب ہاتھی نے اُس ٹوٹے ہوئے پیڑ کے تنے پر پاؤں رکھے اور پھر ہمارے پیڑ تک پہنچ گیا یہاں تک کہ اس نے اپنی سونڈ سے اس ٹہنی کو چھو لیا جس پر ہم بیٹھے تھے۔ جونہی اس نے ایسا کیا وہ چنگھاڑا چونکہ انسان کی بو سے سبھی جانور ڈرتے ہیں، اور اُس نے اپنی سونڈ پیچھے کھینچ لی۔ چنگھاڑتے ہوئے اور من میں کڑھتے ہوئے اُس نے اپنی سونڈ پھر سے بڑھائی۔ عین اُسی وقت گھونڈ نے تقریباً ہاتھی کے نتھنوں میں چھینک ماری جس سے ہاتھی کا دل دہشت سے بھر گیا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ آدمیوں نے اُسے گھیر لیا ہے۔ ایک خوفزدہ شیطان کی طرح ہُنکارتا اور چنگھاڑتا ہوا جنگل میں سرپٹ بھاگا اور جو چیز اس کے راستے میں سامنے آئی اسے توڑتا ہوا نکل گیا۔ اب سبز بادبانوں جیسے موٹے طوطے آسمان میں اڑنے لگے۔ بندروں نے ایک سے دوسرے پیڑ پر بھاگ دوڑ اور چٹر پٹر شروع کر دی۔ جنگلی سؤر اور بارہ سینگھے جنگل کی دھرتی کو اپنے سُموں سے روندنے لگے۔ کچھ دیر تک یہ شور شرابا بے روک ٹوک چلتا رہا۔ ہمیں اپنے گھر کی جانب سفر شروع کرنے کا حوصلہ کچھ دیر بعد ہوا۔

اس روز دن میں دیر گئے ہم اپنے گھر پہنچے۔ خوش قسمتی سے ہمیں راستے میں ایک قافلہ اُدھر جاتا مل گیا جو ہمیں گھوڑوں کی پیٹھ پر بٹھا لے گیا۔ ہم تینوں بری طرح تھکے ماندے تھے لیکن جب ہم نے دن تمام پہنچ کر اپنے گھر میں رنگیلے کو گھونسلے میں دیکھا تو ہم ساری تکان بھول گئے۔ آہا! کیا خوشی کا موقعہ تھا۔ اُس شام سونے سے پہلے مجھے لاما کی وہ پُرسکون اور خاموش یقین دہانی یاد آئی جس نے یہ فرمایا تھا۔ ''تمہارا پرندہ صحیح سلامت ہے۔''

رنگیلے کا فرار ہونا

لیکن ہماری گھر واپسی کے ایک دن بعد رنگیلا صبح پھر سے اڑ گیا اور بعد میں اس کے درشن نہیں ہوئے۔ اگلے چار دنوں تک ہم بڑی تشویش کے ساتھ اس کا انتظار کرتے رہے اور تب مزید دیر تک اس بے یقینی کی حالت کو برداشت نہ کرتے ہوئے گھونڈ اور میں اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اُسے مُردہ یا زندہ کسی بھی حالت میں کھوج ہی نکالیں گے۔ اس بار ہم سکّم تک پہونچنے کے لیے دو ٹٹو بھاڑے پر لے لیے۔ ہمیں جس جس گاؤں سے بھی گزرنا پڑا، وہیں لوگوں سے رنگیلا کے بارے میں پتہ لگاتے لگاتے ہم نے اپنا راستہ متعین کر لیا۔ بیشتر لوگوں نے رنگیلا کو دیکھا تھا اور بعض نے تو اس کا ہو بہو حلیہ بھی بتایا۔ ایک شکاری نے اُسے ایک بدھ راہب گھر میں مکالن کی اولتی کے نیچے ایک ابابیل کے گھونسلے کے برابر میں آشیانہ بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک اور بدھ راہب نے کہا کہ اُس نے سکّم میں ان کے راہب گھر کے نزدیک ندی کنارے اُسے دیکھا تھا جہاں جنگلی بطخوں کے گھونسلے تھے۔ دوسرے روز دوپہر کو جس آخری گاؤں سے ہم گزرے وہاں ہمیں بتایا گیا کہ اُسے ابابیلوں کے ایک قافلے کی رفاقت میں دیکھا گیا تھا۔

ان صحیح معلومات کی روشنی میں ہم سکّم کے سب سے بلند پٹھار پر پہنچے اور تیسری رات

ہمیں مجبوراُ وہاں رُکنا پڑا۔ ہمارے ٹٹوؤں کو بھی نیند آ رہی تھی اور ہمیں بھی۔ لیکن شاید گھنٹے بھر کی نیند کے بعد ہی ہمیں ایک تناؤ نے بیدار کر دیا جو ہر چیز پر چھا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے دونوں لدّو جانور (ٹٹو) جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں اور آسمان میں نکلے ہوئے آدھے چاند کی روشنی میں بالکل اکڑے ہوئے کھڑے تھے اور ان کے کان احتیاط سے کچھ سننے کی کیفیت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی دم تک نہیں ہلا رہے تھے۔ میں نے بھی غور سے سننا شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سناٹا محض قدرتی سکوت نہیں تھا۔ قدرتی سکوت خالی ہوتا ہے لیکن جس سناٹے نے ہمیں گھیر رکھا تھا وہ معنی خیز تھا، جیسے کوئی دیوتا، چاندی پاؤں میں پہنے ہوئے اس قدر قریب سے گزر رہا تھا کہ اپنا ہاتھ پسار کر اُس کے لباس کو چھو سکتا تھا۔

اُسی وقت ٹٹوؤں نے اپنے کان ہلائے جیسے کسی آواز کی گونج کو جو اُس غیر محسوس سناٹے میں سے گزری تھی، پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ عظیم دیوتا تو پہلے ہی وہاں سے گزر چکا تھا۔ اب تو ایک انوکھی سی سرسراہٹ جو تناؤ بھرے ماحول کو آسودہ کر رہی تھی، چھانے لگی۔ گھاس کی ہلکی سی جنبش بھی ایسے میں کوئی سن سکتا تھا۔ لیکن یہ کیفیت بھی لمحاتی تھی۔ اب ہمارے ٹٹو شمال سے آنے والی ایک اور آواز کو دھیان سے سن رہے تھے اور وہ اِس کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ آخر کار تو یہ آواز مجھے بھی سنائی دے گئی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی بچّہ نیند میں جماہی لے رہا ہو۔ سناٹا پھر سے چھا گیا۔ پھر ایک آہ جیسی آواز جو کافی طویل تھی ہوا میں پھیلی۔ پھر یہ مدھم پڑتی گئی۔ جیسے کوئی بہت موٹا سبز پتہ آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب رہا ہو۔ پھر اُفق پر ایک سرگوشی سی ابھری جیسے کوئی آسمان کی سرحد پر عبادت کر رہا ہو۔ ایک منٹ بعد ٹٹوؤں کے کان ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اپنی دُمیں ہلانے لگے اور میں نے بھی خود کو پُر سکون محسوس کیا۔ یہ لو! ہزاروں ہنس ہوا میں اونچی سطح پر پرواز کر رہے تھے۔ وہ ہم سے کم از کم چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہوں گے تو بھی ٹٹوؤں نے مجھ سے بہت پہلے اُن کی آمد کی آہٹ پہچان لی تھی۔

کل ہنسوں کی اڑان نے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ صبحِ صادق اب نزدیک ہے۔ میں،

سیدھا بیٹھ گیا اور غور سے دیکھتا رہا۔ ستارے ایک ایک کر کے ڈوب گئے۔ ٹٹو گھاس چرنے لگے۔ میں نے اُن کی رسّیاں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اب تو رات بیت چکی تھی اور انہیں اب آگ کے بہت قریب باندھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اگلے دس منٹوں میں صبحِ صادق کے گہرے سکوت نے ہر شے کو اپنے غلبے میں لے لیا اور اس کا اثر ہمارے دونوں جانوروں پر بھی پڑا۔ اب میں صاف دیکھ رہا تھا کہ دونوں نے اپنے سر اوپر اٹھائے اور توجّہ سے سننے لگے۔ کیا جانے وہ کن آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے یہ جاننے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک پیڑ میں جو بہت دُور نہیں تھا، ایک پرندے نے حرکت کی، تب ایک اور پرندے نے بھی دوسری ٹہنی پر وہی کیا۔ ان میں سے ایک نے گانا شروع کیا۔ یہ گانے والی چڑیا تھی اور اس کے الاپ سے تمام فطرت جاگ اٹھی تھی۔ دوسری گائک چڑیوں نے بھی تان اڑائی اور پھر کچھ اور پرندوں نے اور پھر مزید کچھ پنچھیوں نے۔ اس طرح گرم خطّے کی مختصر گھڑی بیت گئی اور گھونڈا اپنی پوجا کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس روز ہماری دشت نوردی بالآخر ہمیں سِنگا لیلا کے نزدیک واقع اُسی بدھ وہار میں لے آئی جس کے متعلّق میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ لاماؤں نے ہمیں بڑی خوشی سے رنگیلے کے بارے میں تمام خبریں بہم پہنچائیں۔ انہوں نے ہمیں اطلاع دی کہ گزشتہ شام رنگیلا اور اُن ابابیلوں کا ٹولا جنہوں نے اُن کے راہب گھر کی اولتی کے نیچے اپنے گھونسلے بنائے ہوئے تھے، جنوب کی جانب پرواز کر گئے تھے۔

اِس بار پھر لاماؤں کا آشیرواد لے کر ہم نے اس مہمان نواز سرائے کو خیر باد کہا اور رنگیلا کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ جب ہم نے ان پر آخری نگاہ ڈالی تو پہاڑ ہمارے عقب میں شعلوں کی طرح روشن تھے۔ ہمارے سامنے تھے خزاں رسیدہ جنگل جو سنہری، ارغوانی، سبز اور گہرے سرخ تابدار رنگ بکھیر رہے تھے۔

رنگیلے کی آپ بیتی

پچھلے باب میں میں نے ان واقعات کے مختصر حوالے دیئے تھے جہاں سے رنگیلا کو بچا کر لایا گیا تھا۔ گھونڈ نے ہمارے عرصۂ تلاش میں، پہلے دن ہی یقین کے ساتھ اس کا سُراغ لگا لیا تھا۔ تاہم ان واقعات کو وضاحت اور تسلسل کے ساتھ دیکھنے سمجھنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ خود رنگیلا ہی اپنے معرکہ خیز سفر کا حال اپنی زبانی بیان کرے۔ اگر ہم تصور کریں تو ہمارے لیے اس کی باتیں سمجھ لینا مشکل نہیں۔

اکتوبر کی اس دوپہر کو جب ہم اپنے شہر کو واپسی کے لیے دارجیلنگ سے ٹرین میں سوار ہوئے تو رنگیلا اپنے پنجرے میں بیٹھا تھا اس نے حال کے دنوں میں دین تام سے سنگالیلا کو اپنے بھاگ نکلنے اور واپسی کی کہانی سنانی شروع کر دی جو اس طرح تھی۔

''اے بہت سی بولیوں کے عالم! اے تمام انسانی اور حیوانی بھاشاؤں کے جادوگر! میری آپ بیتی غور سے سنو۔ ایک کمزور پرندے کی تھتھلاتی اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کا تذکرہ سنو۔ جس طرح دریا کا منبع پہاڑ میں ہوتا ہے اسی طرح میری کہانی بھی پہاڑوں سے جنم لیتی ہے۔''

''جس عقاب کے گھونسلے کے قریب میں نے اس خبیث باز کے بچوں کو میری ماں کے جسم کو چیر کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے دیکھا تو میں اس قدر غم زدہ ہوگیا کہ میں نے مرجانے کا

فیصلہ کر لیا لیکن ان دغاباز پرندوں کے پنجوں کے ذریعے نہیں۔ اگر مجھے کسی کی غذا ہی بننا تھا تو کیوں نہ ہوا کے بادشاہ یعنی عقاب ہی کا نوالہ بنوں۔ اس لیے میں اوپر کو اڑا اور عقاب کے گھونسلے کے نزدیک اس کے اڈے پر بیٹھ گیا لیکن ان پرندوں نے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچائی۔ ان کے گھر میں ماتم چھایا ہوا تھا۔ ان کا باپ مارا جا چکا تھا اور ان کی ماں تیتروں اور خرگوشوں کے شکار کے لیے باہر گئی ہوئی تھی چونکہ اب تک یہ ننھے بچے وہی کچھ کھاتے پیتے تھے جو ان کے لیے مار کر لایا جاتا تھا۔ اس لیے مجھ بیچارے پر، جو زندہ تھا، حملہ کرنے کا ان کا حوصلہ نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ اب تک کسی بھی عقاب نے مجھے کوئی ضرر کیوں نہیں پہنچایا حالانکہ گزشتہ دنوں میں نے بہت سے عقاب دیکھے ہیں۔

تب تم مجھے پکڑنے اور پنجرے میں ڈالنے کے لیے آئے۔ چونکہ اب میرا انسان کی رفاقت کو جی نہیں چاہ رہا تھا، میں اڑ گیا، آگے اپنا مقدر آزمانے کے لئے۔ لیکن مجھے وہ تمام جگہیں اور وہ تمام اشخاص یاد تھے جو تمہارے دوست تھے۔ اور دین تام کو واپس جاتے ہوئے راستے میں میں نے ان کے یہاں قیام کیا۔ ان دو دنوں میں، چونکہ میں نے صرف دو دن ہی اڑان بھری ایک نوسکھئے باز نے جس نے ابھی نیا نیا اڑنا سیکھا تھا مجھ پر حملہ کیا اور میں نے اسے اس کی زندگی کی سب سے بھاری شکست دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک صبح جب میں سکم کے نشیبی جنگلوں میں پرواز کر رہا تھا میں نے اپنے سر کے اوپر ہوا میں کلکاری کی آواز سنی۔ اب مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ چنانچہ میں نے ایک چالاکی کی۔ میں ایک دم رک گیا اور باز میرے اوپر ہی گر رہا تھا، اپنے نشانے سے چوک گیا اور کافی نیچے تک چلا گیا اور اس کے پنکھ ایک درخت کی چوٹی سے رگڑ کھا گئے۔ اب میں اور اونچا اٹھ گیا اور تیزی سے اڑنے لگا لیکن اس نے مجھے آلیا۔ تب میں ہوا میں چکّر کاٹنے لگا۔ میں اور اونچا نکل گیا۔ آہ! اتنا اونچا کہ میرے پھیپھڑوں کے لیے ہوا میں سانس لینا دشوار ہوگیا اور مجھے پھر سے نیچے اترنا پڑا۔

لیکن جونہی میں نیچے کو اترا ایک منحوس چنگھاڑ کے ساتھ باز مجھ پر جھپٹ پڑا۔ خوش قسمتی

سے وہیں اس وقت زندگی میں پہلی بار میں نے قلابازی لگانے کی کوشش کی جیسے میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا، اور میں دوہری قلابازی لگانے میں کامیاب ہوگیا اور پھر اوپر کو یوں اچکا جیسے کوئی فوارہ چھوٹتا ہے۔ باز کا وار پھر خالی گیا اور وہ پھر حملہ کرنے کے لیے اوپر کو اڑا لیکن میں نے اسے حملے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں اس کے اوپر اڑا اور عین اس وقت جب میں اس کے اوپر سے گزر رہا تھا اس نے نیچے کو غوطہ لگایا اور پھر اوپر کو اُچکا اور اپنا پنجہ بڑھایا۔ میں نے پھر قلابازی کھائی اور اس کے ساتھ اتنے زور سے ٹکرایا کہ باز اپنا توازن کھو بیٹھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت کیا ہوا لیکن اسی پل مجھے محسوس ہوا کہ کوئی چیز مجھے نیچے کو اور دھرتی کی جانب کھینچے لیے جا رہی ہے۔ میرے پنکھ بالکل بے قوت ہو چکے تھے۔ میں ایسے گرا جیسے کوئی عقاب گرتا ہے، بھاری اور اچوک —— اپنے پورے وزن کو باز کے سر کے اوپر ٹکراتا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس چوٹ سے وہ حواس باختہ ہو گیا۔ وہ بھی نیچے گرا اور نیچے کے جنگلوں میں کھو گیا لیکن مجھے خوشی ہوئی جب میں نے خود کو ایک شاہ بلوط کے پیڑ کی ٹہنی پر پایا۔

مجھے دراصل ہوا کے رَو نے نیچے کی جانب کھینچ لیا تھا۔ زندگی کے اس پہلے تجربے سے لے کر اب تک مجھے اسی طرح کے بہت سے تجربے پیش آ چکے ہیں لیکن ابھی تک یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بعض درختوں کے اور دریاؤں کے اوپر کی ہوا بے انتہا سرد ہو جاتی ہے اور یہ ایک رَو بن جاتی ہے جو اس سے ٹکرانے والے پرندے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ مجھے ان روؤں میں اڑنے کا سبق سیکھنا پڑا جب انہوں نے مجھے اوپر نیچے چکر کھلائے لیکن میں ان روؤں سے نفرت نہیں کرتا چونکہ ہوا کی وہ تیز رو جس سے سب سے پہلے میرا سامنا ہوا اس رَو نے میری جان بچائی تھی۔

بلوط کے اس پیڑ پر بیٹھے ہوئے مجھے اس قدر بھوک لگی کہ میں واپس گھر کی جانب پرواز کرنے پر مجبور ہو گیا۔ خوش قسمتی سے میری تیر کی طرح سیدھی اڑان کے دوران کسی بے رحم باز نے میرا راستہ نہیں روکا۔

لیکن اس نوسکھئے قاتل سے صحیح سلامت بچ نکلنے کے واقعے نے میری ہمّت بحال کر

دی۔ اور جونہی تم واپس گھر پہونچے میں نے من ہی من سوچا اب جب میرے دوست نے مجھے زندہ دیکھ لیا ہے وہ میرے بارے میں فکرمند نہیں رہے گا۔ اب مجھے پھر سے ایک بار بازوں سے بھری ہوا میں اڑ کر اپنے ہمّت و حوصلہ کی آزمائش کرنی چاہئیے۔

اب میرا اصل معرکہ شروع ہوا۔ میں شمال کی جانب عقابوں کے گھونسلے کی طرف روانہ ہو گیا اور بودھ وہار میں بھی رکا جہاں ایک مقدس بھکشو نے مجھے پہلے ایک موقع پر دعا دی تھی۔ وہاں میں اپنے پرانے دوستوں میاں ابابیل اور بیگم ابابیل سے ملا۔ شمال کی جانب بڑھتا ہوا میں سنگا لیلا سے بھی آگے نکل گیا اور ان عقابوں کے گھونسلے تک جا پہنچا۔ وہ اڑ کر باہر جا چکے تھے۔ لہٰذا میں نے وہاں آرام کیا لیکن وہاں زیادہ خوشی نہیں ملی چونکہ عقاب اپنے گھونسلوں میں ہر طرح کی گندگی چھوڑ دیتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ گھونسلے کیڑوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنا دن عقابوں کے آشیانے میں بسر کیا مگر میں نے اپنی رات ایک درخت پر گزارنے کا فیصلہ کیا جہاں میں ان خطرناک کیڑوں سے محفوظ رہ سکوں۔ عقابوں کے گھونسلے میں میرے داخل ہونے اور باہر آنے سے دو روز کے بعد دوسرے پرندوں میں مجھے بڑا وقار حاصل ہو گیا۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگے چونکہ انہوں نے مجھے بھی عقاب کی نسل کا پرندہ سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ باز بھی مجھے محترم سمجھنے لگے۔ اس سے مجھے اور بھی خود اعتمادی ملی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ لہٰذا ایک صبح سویرے سفید پرندوں کے ایک جھنڈ کو جنوب کی جانب جاتا ہوا اور آسمان میں بہت اونچا پرواز کرتا دیکھ کر میں بھی شامل ہو گیا۔ انہوں نے میری شمولیت کا برا نہیں مانا۔ یہ جنگلی کل ہنس تھے جو دھوپ والے سمندروں کی تلاش میں سری لنکا اور اس سے آگے کے سفر کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔

یہ کل ہنس دو گھنٹوں کی اڑان کے بعد جب دن خاصا گرم ہو گیا ایک تیز رو ندی کے کنارے اتر گئے۔ عقابوں کے برعکس وہ نیچے کی طرف شاذ و نادر ہی نگاہ کرتے تھے۔ البتہ وہ افق کی لکیر پر نظر جمائے رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت دور آسمان پر ایک سفیدی مائل نیل دھاری کو دیکھ لیا اور آہستہ آہستہ جھکتی ایک سیدھی قطار کی صورت میں نیچے کا رخ کیا۔ حتٰی کہ ایسا لگا کہ جیسے دھرتی

ہمیں ملنے کے لیے اوپر اٹھ رہی ہو۔ جلد ہی وہ سب چاندی جیسی ندی میں کود پڑے کیوں کہ اب پانی نیلگوں کے بجائے سیم گوں لگ رہا تھا۔ وہ پانی پر تیرنے لگے۔ لیکن چونکہ مجھے پتا تھا کہ میرے پاؤں جھلّی دار نہیں ہیں میں ایک درخت پر جا بیٹھا۔ اور ان کے کھیل تماشے دیکھنے لگا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ان کل ہنسوں کی چونچیں کتنی چپٹی اور بھدی ہوتی ہیں لیکن اس کی وجہ مجھے اب معلوم ہوئی۔ وہ اپنی چونچوں کو کنارے پر اگنے والے شنکھوں کے لیے چمٹی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اکثر کوئی کل ہنس اپنی چونچ کسی پودے پر یا شنکھ پر مارتا اور اسے اپنی جگہ سے یوں مروڑ لیتا جیسے قصائی کسی کل ہنس کی گردن مروڑتا ہے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے طاقتور گلے میں کچل کر سالم نگل جاتا اور اس سے پہلے کہ یہ نوالہ اس کے پیٹ میں کافی نیچے پہنچتا اس کا قد گھٹ کر صفر ہو چکتا تھا۔ میں نے ایک کل ہنس کو تو اس سے بھی مکروہ کام کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دریا کے کنارے کے قریب ایک بل میں سے ایک مچھلی پکڑی جو پانی والے سانپ کی طرح پتلی تھی۔ اس نے اسے کھینچنا شروع کیا۔ جتنا وہ اسے کھینچتا اتنی زیادہ وہ باریک اور لمبی ہوتی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ ایک خوفناک کشمکش کے بعد وہ اسے بل سے باہر کھینچنے میں کامیاب ہوگیا۔ تب وہ ہنس پھدک کر کنارے پر جا بیٹھا اور مچھلی کو وہاں دھرتی پر ڈال دیا۔ اس نے اپنی چونچ میں مچھلی کا جو حصّہ پکڑ رکھا تھا اسے تو اس کی چونچ پہلے ہی پوری طرح کچل کر بھرتہ بنا چکی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی کہ اس کا چھٹپٹاتا ہوا شکار پہلے ہی مر چکا تھا۔ پھر کہیں سے ایک اور کل ہنس اس کے پاس پہنچ گیا۔ قطع کلام کے لیے معافی! کیا یہ کل ہنس جب اڑ نہ رہے ہوں یا تیر نہ رہے ہوں، تب بہت بدنما پرندے نہیں ہوتے؟ پانی میں تو یہ ایسے لگتے ہیں جیسے نیند کے تالاب پر سپنے تیر رہے ہوں۔ لیکن زمین پر وہ بیساکھی کے سہارے چلنے والے لنگڑوں کی طرح لنگڑاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک وہ دونوں کل ہنس آپس میں جھگڑنے لگے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پروں کو نوچتے اور اپنے اپنے پنکھوں سے دوسرے کو چپت لگاتے تھے۔ جب بھی وہ دھرتی سے اوپر پھدکتے تو ایک دوسرے کو پیروں سے ٹھوکریں مارتے۔ جب وہ باہمی جھگڑے کی جڑ اس مچھلی کو

بھول کر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے تو بلی کی شکل کا ایک جانور —— شاید کوئی اود بلاؤ سرکنڈوں میں سے جھپٹا۔ اُس نے مچھلی کو اچک لیا اور غائب ہوگیا۔ اب کل ہنس نے باہمی صلح کا اعلان کرلیا لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ آہ! یہ عقل کے اندھے ہنس کے ہنس ہی رہے۔ ان کے مقابلے میں تو ہم کبوتر چالاکی کا بے نظیر نمونہ ہیں۔

جب انہوں نے باہم لڑنا بند کیا تو ہنسوں کے کھیا نے آواز لگائی "کلک۔ کا۔ کا۔ کا۔" (یعنی اب اڑ چلو)۔ اسی لمحے وہ سب اپنی رفتار بڑھانے کے لیے پانی میں تیزی سے پنکھ چلانے لگے۔ اور یہ لو، وہ لو۔ اب وہ ہوا میں تھے۔ اب وہ کتنے خوبصورت نظر آرہے تھے۔ اور ان کے جوڑے پنکھوں کا، گردن اور جسم کا ہلکے ہلکے سرسرانا ایسا لگتا تھا جیسے آسمان میں تصویریں بنی ہوں جو آنکھوں کو فرحت بخشنے والی چوکھٹوں سے سجی ہوں۔ میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔

لیکن ہر جھنڈ میں کوئی نہ کوئی بچھڑ جانے والا بھی ہوتا ہے۔ ایک کل ہنس پیچھے چھوٹ گیا چونکہ وہ ابھی تک ایک مچھلی کے ساتھ کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔ آخر کار وہ مچھلی اس نے ہتھیالی اور کسی درخت کی تلاش میں اڑا جہاں بیٹھ کر اُسے کھا سکے۔ دفعتاً خلا میں سے ایک زبردست باز اُس پر حملہ آور ہوا۔ ہنس اوپر اڑا لیکن باز بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ آسمان میں اوپر، اور اوپر وہ چیختے اور کگیاتے ہوئے چکر کاٹنے لگے۔ اچانک ایک کل ہنس کی مدّھم لیکن صاف آواز سنائی دی۔ اُس جھنڈ کا کھیا بچھڑے ہوئے ہنس کو پکار رہا تھا۔ اس آواز سے اس کا دھیان مچھلی کی طرف سے ہٹ گیا۔ پکار کے جواب میں اس نے بھی آواز لگائی۔ اسی پل مچھلی اس کے منہ سے چھوٹ کر گر گئی۔ یہ ایک پتے کی طرح گرنے لگی۔ باز نے اسے جھپٹنے کے لیے نیچے غوطہ لگایا اور عین اس وقت جب وہ اسے اپنے پنجوں سے چیرنے والا تھا ہوا میں ایک زبردست ہلچل اور چنگھاڑ گونجی۔ پل بھر میں ایک عقاب اس باز پر ایسے گرا جیسے کسی ڈھلان سے پتھر گرتا ہے۔ باز اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا۔ اس نظارے کو دیکھ کر میں بہت لطف اندوز ہوا۔

عقاب کے بادبانوں جیسے پنکھوں کے نیچے اس کے پنجے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ

ابھرے اور انہوں نے مچھلی کو جھپٹ لیا۔ تب وہ ہوا کا شہنشاہ اپنے بھورے سنہری تابدار زرہ بکتر میں ملبوس دور اڑ گیا۔ ہوا اس کے گھٹنوں سے اوپر اس کے بال و پر کو پھڑ پھڑا رہی تھی اور باز اپنی جان بچانے کے لیے ابھی تک دور بھاگا جا رہا تھا۔

میں خوش قسمت تھا کہ وہ اب بہت دور چلا گیا ہے اب مجھے واپسی کی سڑک کی تلاش تھی جہاں مجھے لوگوں کے گرائے ہوئے کچھ دانے کھانے کو مل سکیں۔ جلد ہی یہ مجھے مل گئے۔ اور میں نے جی بھر کر دانہ کھایا۔ کھا لینے کے بعد درخت پر جا بیٹھا اور سو گیا۔ جب میں بیدار ہوا تو بعد دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے اڑ کر اس مبارک بدھ وہار تک پہنچنے کا فیصلہ کیا جہاں میں اپنی دوست ابابیلوں سے مل سکوں۔ میری یہ اڑان کسی بھی ناخوشگوار سانحے سے خالی تھی چونکہ اب تک میں نے پوری ہوشیاری سے اڑنا سیکھ لیا تھا۔ میں عموماً بہت بلندی پر اڑتا تھا اور نیچے بھی دیکھتا رہتا تھا اور افق پر بھی نگاہ رکھتا تھا ہر چند کہ میری گردن اتنی لمبی نہیں جتنی کہ کلہنس کی ہوتی ہے۔ تاہم میں اڑتے ہوئے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا اور چند منٹوں کے وقفے سے دائیں بائیں بھی نگاہ ڈال لیتا تھا، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ کوئی مجھ پر پیچھے سے تو حملہ نہیں کر رہا ہے۔

میں راہب گھر میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا جب لاما لوگ اپنی عبادت گھر کے کنارے پر کھڑے ہونے کو تیار تھے جہاں کھڑے ہو کر وہ غروبِ آفتاب کے وقت دنیا کے لیے دعا کرتے ہیں۔ میاں ابابیل اور بیگم ابابیل اس گھونسلے کے قریب اڑ رہے تھے جہاں ان کے تین بچے سوئے ہوئے تھے۔ جی ہاں وہ میرا خیر مقدم کرتے ہوئے بہت خوش ہوئے۔ راہبوں نے دن ڈھلے کی اپنی پوجا کے بعد مجھے کھانا کھلایا اور شیریں مزاج بزرگ لاما نے مجھے دعا دی۔ تب میں اڑ گیا۔ اب میں خود کو بالکل نڈر محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ذہن اور جسم کی اس کیفیت کے ساتھ راہب گھر کی اولتی کے نیچے ابابیلوں کے گھونسلے کے برابر میں تعمیر کردہ اپنے گھونسلے میں داخل ہوا۔

اکتوبر میں راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ صبح کو جب پجاری گھنٹیاں بجا رہے تھے تو ابابیلوں کے ننھے بچے کسرت کے لیے ادھر ادھر دوڑنے لگے جبکہ ان کے ماں باپ کو اور مجھے صبح کی سردی کو

بھگانے کے لیے اڑنا پڑا۔ وہ دن مجھے وہیں گزارنا پڑا تاکہ جنوب کی جانب ان ابابیلوں کے سفر کی تیاری میں ان کی مدد کر سکوں۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ان کا ارادہ سری لنکا یا افریقہ میں اپنا گھونسلا تعمیر کرنے کا تھا جدھر وہ جا رہی تھی۔ انہوں نے مجھے وضاحت سے بتایا کہ ابابیل کے گھونسلے کی تعمیر کوئی آسان کام نہیں۔ میرے علم کی پیاس بجھانے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر کس طرح تعمیر کرتی ہیں۔"

رنگیلے کا معرکہ خیز سفرنامہ (جاری)

گھونسلے کے تعمیر کے فن میں ابابیلوں کی ہنرمندی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی دقتوں کا بھی علم ہو۔ ابابیل کی چونچ چھوٹی سی ہوتی ہے جو اڑنے والے کیڑوں کو پکڑنے کے لائق ہوتی ہے۔ اس کا منہ بہت چوڑا ہوتا ہے جس سے اسے اڑتے ہوئے شکار کو بھی دبوچنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے کھلے چوڑے منہ سے بہت کم ہی کیڑے بچ پاتے ہیں، جب وہ ان پر جھپٹتی ہے۔ میاں ابابیل چونکہ بہت چھوٹے ہیں اس لیے وہ زیادہ وزن نہیں اٹھا سکتے۔ لہٰذا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ان کا گھونسلا بہت ہی نازک سامان سے تیار کیا جاتا ہے جیسے کہ تنکے اور درختوں کی پتلی شاخیں جو ایک درمیانے ماپ کی سوئی سے زیادہ موٹی نہیں ہوتیں۔

''جب میں نے ابابیل کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ مفلوج اور بدشکل نظر آئی تھی۔ سب ابابیلیں جانتی ہیں کہ ان کی ٹانگیں کمزور ہوتی ہیں۔ اس پرندے کی ٹانگیں مشکل سے اس قابل ہوتی ہیں کہ ان پر وہ اپنا توازن قائم رکھ سکے۔ مچھلی کے کانٹوں جیسے اُس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں بس اتنی توفیق رکھتے ہیں کہ جہاں وہ بیٹھے اُس جگہ سے چپک سکے۔ یہ پاؤں اُس کے جسم کے باہر اُبھرے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے خم دار پنجے غیر لچکیلے لگتے ہیں۔ اس کے جسم اور پیروں کے درمیان ٹانگوں کی لمبائی کافی کم ہوتی ہے، جس کے باعث وہ اس لچک سے محروم ہوتی

ہے جو لمبی ٹانگیں دوسرے پرندوں کو عطا کرتی ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی اچنبھا نہیں کہ وہ نہ پھدک سکتی ہے اور نہ کود سکتی ہے لیکن اس کی اس معذوری کا ازالہ اُس کی محض ایک خاصیت سے ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ابابیل پتھر کے کٹہروں، سنگِ مرمر کی اولتیوں اور گھروں کے مرمریں کنگروں سے چمٹ سکتی ہے حالانکہ یہ دوسرے پرندے نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنی دوست ابابیل کو روغنی دیواروں کے ساتھ ایسے لٹکا ہوا دیکھا ہے جیسے یہ جھری دار سطحیں ہوں۔

ان معذوریوں کے پیشِ نظر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ اپنا گھر بنانے کے لیے مکانوں اور اولتیوں کے نیچے دیواروں میں کوئی سوراخ ڈھونڈھتی ہے۔ لیکن ان میں وہ اپنے انڈے نہیں دے سکتی چونکہ وہاں سے لڑھک جائیں گے۔ اس لیے وہ اڑتے ہوئے تنکے اور درختوں سے گرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتے پکڑ لیتی ہے اور انہیں اپنے منہ کے لعاب سے اپنے گھونسلے کے پتھریلے فرش کے ساتھ چپکا دیتی ہے۔ فنِ تعمیر میں ابابیل کی مہارت کا راز یہی ہے۔ اس کے منہ کا لعاب حیرت انگیز شے ہے۔ یہ خشک ہو کر بڑھئی کے بہترین سریش جیسا سخت ہو جاتا ہے۔ جب یہ گھونسلا تیار ہو جاتا ہے تو سفید رنگ کے لمبے انڈے دیئے جاتے ہیں۔ ابابیلوں میں مادہ ابابیلیں اتنی آزاد نہیں جتنی کبوتریاں ہیں۔ ہمارے یہاں کبوتریوں کو نر کبوتر کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ لیکن مادہ ابابیل کو نر کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر میاں ابابیل کبھی انڈوں کے اوپر بیٹھ کر انہیں نہیں سیتا۔ وہ اپنی بیوی سے یہ کام کرواتا ہے۔ گاہے بگاہے وہ اپنی مادہ کے لیے دن میں کھانا لے کر آتا ہے ورنہ وہ اپنے اوقات دوسرے نر ابابیلوں کے ساتھ ملنے جلنے میں گزارتا ہے جن کی اپنی بیویاں بھی اسی طرح انڈے سینے کے کام میں مصروف ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے دوست میاں ابابیل کو کہا تھا کہ اسے کبوتروں کی تقلید کرنی چاہئے اور اپنی بیوی کو زیادہ آزادی دینی چاہئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اُس نے میرے اس مشورے کو محض میرا لاڈ کا پیارا سا مذاق سمجھ لیا۔

آخر کار ہماری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور موسمِ خزاں کی ایک سہانی صبح کو پانچوں ابابیلیں

اور میں میاں ابابیل کی سربراہی میں جنوب کی سمت روانہ ہو گئے۔ ہم سیدھی لکیریں جنوب کی جانب نہیں اڑے بلکہ ٹیڑھے میڑھے اڑتے رہے کبھی مشرق کو اور کبھی مغرب کے رخ، اگرچہ کلّی طور پر ہم جنوب کے رخ پر ہی ٹکے ہوئے چلے۔ ابابیلیں، ندیوں اور جھیلوں پر منڈلانے والے کیڑوں اور مچھروں کو کھاتی ہیں۔ وہ لگ بھگ پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتی ہیں جو کہ ایک چھوٹے پرندے کے لیے غیر معمولی رفتار ہے۔ وہ جنگلوں کو پسند نہیں کرتیں۔ چونکہ وہ کیڑوں مکوڑوں کی تلاش میں نیچے کو نگاہ جمائے رکھتی ہیں ایسے میں ان کے پنکھ کسی درخت سے ٹکرا کر ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ وہ پانیوں کے اوپر کے کھلے اور صاف خلا کو ترجیح دیتی ہیں اور اپنے درانتی جیسے لمبے پنکھوں کے ساتھ وہ ہوا کو اتنی تیزی سے چیرتی ہیں جتنی رفتار سے ایک عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ابابیل کی آنکھ اور منہ کا کمال ملاحظہ ہو۔ جب وہ پانی کے اوپر منڈلا رہی ہوتی ہے وہ اڑتے ہوئے کیڑوں کو اتنی آسانی سے نگل لیتی ہے کہ جس حصے میں سے وہ گزرتی ہے وہ ان مکھیوں اور مچھروں سے بالکل خالی ہو جاتا ہے جو کچھ لمحے پہلے وہاں دھوپ میں ناچ رہے ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہم کئی ندیوں، تالابوں اور دلدلوں سے گزرے۔ قطع کلامی معاف! میاں ابابیل اپنا کھانا بہت جلدی جلدی کھاتے ہیں اور پانی بھی اسی انداز سے پیتے ہیں۔ وہ پانی کے اوپر سے اڑتے اڑتے ہی پانی کی بوندیں اپنے منہ میں اچک لیتے ہیں اور انہیں بڑی تیزی سے نگل جاتے ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایسی جگہوں میں اڑنے سے گریز کرتے ہیں جہاں ٹہنیوں، چیڑ کے پیڑوں اور پودوں کی بہتات ہو۔

لیکن کھلی ہوا میں اتنی لمبی اڑان کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ جب کوئی ابابیل اتنی تیز رفتار سے کیڑے کھا رہی ہو تو اوپر سے اس پر کوئی باز بھی جھپٹ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ابابیل نیچے کو غوطہ نہیں لگا سکتی چونکہ اس کا نتیجہ ہو گا ڈوب جانے سے موت۔ میں آپ کو ایسے ہی ایک حملے کے بارے میں بتاتا ہوں جو ہمارے دوستوں پر ہوا۔ ایک دن بعد دوپہر یہ دونوں (میاں بیوی) ایک وسیع جھیل کے اوپر اپنی خوراک کو پکڑنے میں مصروف تھے جبکہ میں ادھر ادھر اڑ رہا تھا لیکن میں

ان دوستوں کے بچوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ تب ایک چڑی مار باز اڑ کر نیچے آیا۔ مجھے، جس نے کہ ان بچوں کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی تھی خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بھی فوری کارروائی کرنی پڑی۔ ایک پل بھی تامّل کئے بغیر میں نیچے کو کودا اور قلابازی لگائی۔ اس طرح میں نے دشمن باز اور ابابیل کے بچوں کے درمیان اپنے جسم کو حائل کر دیا۔ چڑیوں کے شکاری باز کو کبھی فاختہ گھرانے کے مجھ جیسے پرندے سے اتنے حوصلے کی امید نہیں تھی۔ نہ ہی وہ میرے وزن کا اندازہ کر سکا۔ میں وزن میں اس سے کم از کم پانچ اونس زیادہ تھا۔ اس نے اپنے پنجے میری دم سے ٹکرائے۔ تھوڑے سے بال و پر نوچے۔ یہ مان کر کہ اس نے کچھ نہ کچھ جھپٹ لیا ہے اس نے ایک دو پل ہوا میں چکر کاٹے۔ اس سے پیشتر اسے یہ احساس ہو کہ اسے میرے کچھ بال و پر ہی ملے ہیں سبھی کی سبھی ابابیلوں نے ایک درخت کی چھال سے لپٹ کر خود کو محفوظ کر لیا جو کسی کی رسائی سے باہر تھا۔ لیکن وہ چڑیوں کا شکاری چھوٹا باز اس قدر جھنجھلایا ہوا تھا کہ وہ مجھ پر ایک بڑے باز جتنی غضبناکی سے جھپٹا۔ تاہم اس کا جسم بہت چھوٹا تھا اور پنجے بھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری کھال تو دور میرے بال و پر کو بھی نہیں چیر سکتے۔ اس لیے میں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا اور اوپر کی جانب قلابازی کھائی۔ اس نے میرا پیچھا کیا۔ میں نیچے کی جانب لپکا۔ اس نے بھی میرے پیچھے نیچے کو غوطہ مارا۔ تب میں نے اوپر کو اڑان بھرنی شروع کی۔ وہ پہلے کی طرح ہی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن یہ چھوٹے باز ہوا کی اونچی سطح سے ڈرتے ہیں۔ اب اس کے پنکھ ڈھیلے پڑ گئے میری پنکھوں کی جستوں تک وہ مشکل سے ایک جست لے سکا۔ اُسے نا امید اور تھکا ہوا دیکھ کر میں نے اسے زندگی بھر کے لیے سبق سکھانے کی ٹھانی۔ جونہی یہ خیال میرے دل میں آیا میں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ میں تیزی سے نیچے کی جانب لپکا۔ اس نے بھی میرے پیچھے نیچے کو ڈبکی لگائی، نیچے، اور نیچے، اور نیچے جھیل کا پانی ہر سیکنڈ ہماری طرف اونچا اور اونچا اٹھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ میرے پنکھ بھر کے فاصلے پر رہ گیا۔ تب میں چند انچ آگے کو سرپٹ بھاگا اور گرم ہوا کی دھارا سے ٹکرایا جس نے اوپر کی طرف اڑنے میں میری مدد کی جیسا آپ کو معلوم ہے نائی مقامات پر ہوا گرم

ہو جاتی ہے اور پہاڑی علاقے میں وادیاں بہت جلد سرد ہو جاتی ہیں۔ہم پرندوں کو جب کبھی ایک دم اوپر کو اڑان بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان گرم ہواؤں کی مدد لیتے ہیں۔ میں نے اب تین بار قلابازی کھائی۔اب جب میں نے پنچے کو دیکھا تو چڑی مار باز پانی میں ڈوبتا دکھائی دیا۔ وہ گرم ہوا کی رو تک نہیں پہنچ پایا۔ کئی بار پانی میں غوطے کھا کر وہ بہت زور مار کر کنارے تک اڑ کر پہنچا۔اور وہاں اس نے گھنے پتوں کے نیچے چھپ کر اپنی ذلت کو چھپانے کی کوشش کی۔ اسی وقت ابابیلیں اپنی پناہ گاہ سے نکل آئیں اور جنوب کی سمت اڑنے لگیں۔

اگلے روز ہماری ملاقات جنگلی بطخوں سے ہوئی۔ میری گردن کی طرح ان کے گلے بھی رنگ برنگے تھے ورنہ وہ برف کی مانند سفید تھیں۔ وہ دریائی بطخیں تھیں جن کی عادت ہوتی ہے کہ پہاڑی ندیوں کے رخ پر تیرتے ہوئے مچھلی کا شکار کرنا۔ جب وہ ندی کے رخ پر تیرتی ہوئی بہت دور نکل جاتی ہیں تو وہ ندی سے باہر نکل آتی ہیں اور اڑ کر واپس اسی مقام پر پہنچ جاتی ہیں جہاں سے وہ روانہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ اسی طرح جولاہے کے ڈھرکی (شٹل) کی مانند دن بھر آمد و رفت میں لگی رہتی ہیں۔کل ہنسوں کے مقابلے میں ان بطخوں کی چونچیں زیادہ چوڑی تھیں اور اندر کو مڑی ہوئی۔اس لیے کہ جب ایک بار وہ مچھلی کے قریب پہنچ جائیں تو ان کی چونچیں کبھی چوکتی نہیں۔ لگتا تھا کہ وہ گھونگھوں کا شکار پسند نہیں کرتیں شاید اس لیے کہ جھیل میں مچھلیاں کثرت سے دستیاب تھیں۔ابابیلوں کو وہ جگہ پسند نہیں آئی چونکہ بطخوں کے پنکھ لگاتار پھڑ پھڑاتے اور ہوا کو ضرب لگاتے تھے جس سے پانی کی سطح کے اوپر اڑنے والے کیڑے دور چلے جاتے تھے۔ پھر بھی وہ بطخوں سے مل کر خوش ہوئیں جو پہاڑوں کی طوفانی ندیوں میں رہنا پسند کرتی ہیں اور ساکت پانی کو وقعت نہیں دیتیں جو بیشتر بطخوں کو پیارا ہوتا ہے۔

انہی جنگلی بطخوں نے ہمیں الوؤں اور رات کو قتل و غارت کرنے والے دوسرے جانوروں کے بارے میں خبردار کیا جو اس خطے میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ہم نے اپنی جانب سے پوری کوشش کی کہ ہم راتوں کو اتنے چھوٹے بلوں میں چھپ کر رہیں جہاں الو

داخل نہ ہو سکیں۔ابابیلوں کے لیے تو درختوں میں ایسے چھوٹے چھوٹے سوراخ ڈھونڈ لینا آسان تھا لیکن میں نے کھلی جگہ میں قیام کرنے اور خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا۔ جلد ہی رات پڑ گئی۔ میری آنکھیں جلد ہی دور تک دیکھنے سے قاصر ہو گئیں۔ان کے اوپر اندھیرے پر اندھیرا سیاہ کپڑے کی تہوں کی طرح چھانے لگا۔ میں نے خود کو اپنی نسل کے دیوتاؤں کی پناہ میں مانگی اور سونے کی کوشش کی لیکن جہاں ارد گرد الو ہو ہلّہ مچا رہے ہوں وہاں نیند کیسے آتی۔ میں ساری رات دہشت زدہ رہا۔ ایک گھنٹہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں کسی نہ کسی پرندے نے درد سے چیخ نہ ماری ہو۔الو بھی اپنی فتح کی خوشی میں ہو ہو کرتے رہے۔ کبھی کوئی مینا تو کبھی کوئی بلبل مرتے مرتے چیختی چلاتی اور الو کی گرفت میں دم توڑ دیتی۔اگرچہ میری آنکھیں بند تھیں۔ میرے کانوں کو اس ساری خونریزی کا پتہ چل رہا تھا جو وہاں جاری تھا۔ایک کوّے نے چیخ ماری پھر دوسرے نے اور پھر ایک اور نے۔ پھر لگ بھگ ایک پورا غول ہی دہشت زدہ ہو کر اوپر کو اڑا اور درختوں سے ٹکرا کر مرنے لگا تھا۔لیکن اس طرح کی موت پھر بھی اچھی، بجائے اس کے کوئی الو کے بدن خراش اور بدن سوز پنجوں اور چونچوں کے ذریعہ مارا جائے۔ مجھے ہوا میں نیولے کی بو آئی تو میں بالکل گھبرا گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ اب موت نزدیک ہے۔ میں مایوس ہو گیا میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ایک زردی مائل سفید سی روشنی سب چیزوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں میرے سامنے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر ایک نیولا بیٹھا تھا۔ میں نے اوپر اڑان بھری اگرچہ اِس سے الوؤں کے ہاتھوں میرے مارے جانے کا اندیشہ بڑھ گیا تھا اور سچ مچ ایک الو ہو ہو کرتا اور چیختا ہوا لپکا۔ دو مزید الو اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ میں نے ان کے پنکھوں کے جھولنے کی آوازیں سنیں اور ان آوازوں کی نوعیّت سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ ہم پانی کے اوپر اڑ رہے ہیں چونکہ ہمارے پنکھوں کی چھوٹی سے چھوٹی گونج بھی پانی میں سنائی دیتی تھی۔ میں کسی بھی سمت میں زیادہ دور نہیں اڑ سکتا تھا۔ مجھے بیک وقت چھ فٹ سے آگے دکھائی نہیں دیتا تھا۔اس لیے میں ہوا میں رکا رہا اس انتظار میں کہ دریا کے اوپر جھکی ہوئی ٹہنیوں کے باعث دریا کی ہوا کو جذب کر رہی کوئی رو میری مدد کرے۔افسوس وہ الو پہلے ہی مجھ

تک آن پہنچے لیکن میں نے قلابازی لگائی اور ایک دائرے میں منڈلانے لگا۔ الوؤں نے بھی میرا تعاقب نہیں چھوڑا۔ میں اور اونچا اٹھ گیا۔ اب تو چاندنی میرے پنکھوں سے پانی کی طرح ٹپک رہی تھی۔ اب مجھے کچھ زیادہ صاف نظر آنے لگا تھا، اس سے میرا حوصلہ بحال ہو گیا۔ لیکن میرے دشمن میرا پیچھا کرنے سے باز نہیں آئے۔ وہ بھی اڑتے ہوئے اور اوپر آ گئے۔ اب ان کی آنکھوں پر بھی زیادہ روشنی پڑی جس سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اگرچہ مکمل طور سے بیکار نہیں ہوئیں۔ ان میں سے دو الو اچانک میری جانب لپکے۔ میں اور اوپر اٹھ گیا اور ان کا نشانہ چوک گیا۔ لیجئے وہ ایک دوسرے پر گرے اور ان کے پنجے آپس میں الجھ گئے اور پنکھ بے بسی میں ہوا میں پھڑ پھڑانے لگے۔ وہ شیطانوں کی طرح چیخے اور ندی کنارے کے سرکنڈوں میں جا گرے۔

اب میں نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا تو یہ جان کر حیران ہو گیا کہ میں تو طلوع ہوتی ہوئی صبح کی روشنی میں اڑ رہا تھا نہ کہ چاند کی چاندنی میں۔ میری دہشت زدہ آنکھیں ٹھیک طرح دیکھ نہیں پائیں تھیں لیکن اب آس پاس کوئی الو نہیں تھا۔ اب وہ بڑھتی ہوئی سورج کی روشنی سے چھپنے کے لیے چھپنے کی جگہیں ڈھونڈھ رہے تھے۔ اگرچہ اب میں نے محسوس کیا کہ میں بالکل محفوظ ہوں، پھر بھی میں اونچے درختوں کے گھنے سائے سے دور دور ہی رہا چونکہ ممکن تھا کہ اب بھی الو وہاں گھات میں دبکا ہوا ہو۔ میں ایک درخت کی چوٹی پر ایک نازک سی شاخ پر بیٹھا رہا جس پر سورج کی روشنی سونے کی ایک قدرتی چھتری کے روپ میں ڈھکے ہوئے تھی۔ دھیرے دھیرے روشنی اور نیچے تک پھیل گئی یہاں تک کہ نیچے ندی کی سفید سطح پر نیولے کی آنکھوں جیسا سبز رنگ لہرانے لگا۔

تبھی میں نے ندی کے کنارے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ کوئلے کے رنگ سے زیادہ کالے دو کوّے سرکنڈوں میں پھنسے ہوئے اور آنکھیں جھپکاتے بے بس الو کو اپنی چونچیں مار مار کر جھنجھوڑ رہے تھے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا اور الو اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا۔ تو بھی رات کو الوؤں نے کوّوں کا جو قتلِ عام کیا تھا وہ بہت بھاری تھا اور اب اس ظلم کا انتقام لینے کی باری تھی

کوّوں کی۔ لیکن ان دونوں کوّوں کے اس طرح پھنسے ہوئے اُلو کو جان سے مار دینے کا منظر مجھ سے نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے میں ان قاتلوں سے دور اپنی دوست ابابیلوں کو ڈھونڈھنے چلا گیا۔ میں نے اپنے رات بھر کے تجربے انہیں سنائے اور ابابیل ماں باپ نے مجھے بتایا کہ وہ بھی رات بھر اذیّت بھری خوفناک چیخیں سنتے رہے اور انہیں نیند نہیں آئی۔ میاں ابابیل نے دریافت کیا کہ کیا باہر سب طرح سے سلامتی ہے؟ اور میرا خیال تھا کہ سب ٹھیک ہے جب ہم باہر آئے تو میں نے دیکھا کہ سرکنڈوں کے بیچ وہ الو مرا پڑا ہے۔

یہ کچھ عجیب بات تھی کہ اس صبح ہمیں دریا پر کوئی بطخ نظر نہیں آئی۔ لگتا تھا کہ صبح صبح بہت سویرے ہی وہ تیرتی ہوئی ندی کے رخ پر جنوب کی سمت چلی گئی ہوں گی۔ ہم نے بھی جنوب کو جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ ہمارے ہی راستے پر جانے والے دوسرے پرندوں کا ہم ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ اس لیے کہ ہجرت کے موسم میں جہاں کہیں کبوتروں، جنگلی مرغوں اور دوسرے پرندوں کے جھنڈ جاتے ہیں ان کے دشمن مثلاً الو، باز اور عقاب بھی ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ خطرے سے بچنے کے لیے اور ایسے صدماتی تکلیف دہ مناظر سے دور رہنے کے لیے، جیسے کہ ہم پہلے دیکھ چکے تھے، ہم مشرق کی جانب اڑے اور دن بھر مشرق کی طرف سفر کر کے ہم نے سنگم کے ایک گاؤں میں آرام کیا۔ اگلے روز آدھا دن ہم جنوب کی سمت اڑتے رہے اور اس کے بعد پھر مشرق کی جانب۔ اس طرح پر پیچ سفر میں بہت وقت تو لگا لیکن ہم تکالیف سے بچ گئے۔ ایک بار ہم طوفان میں گھر گئے جس نے ہمیں ایک جھیل کے خطے کی طرف دھکیل دیا اور وہاں میں نے ایک حیران کُن نظارہ دیکھا۔ میں ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا تھا جب نیچے بہت سی گھریلو پالتو بطخیں پانی پر تیرتی نظر آئیں۔ ہر ایک کے منہ میں ایک ایک مچھلی تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنا نوالہ نگل نہیں لیا۔ میں نے آج تک کبھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی بطخ مچھلی کھانے کے لالچ سے خود کو روک پائی ہو چنانچہ میں نے یہ نظارہ دکھانے کے لیے ابابیلوں کو بلایا۔ انہوں نے کئی درختوں کے تنوں سے چمٹ کر بطخوں کو دیکھا لیکن انہیں اپنی آنکھوں پر مشکل سے یقین آ رہا تھا۔ آخر کیا ہوا

تھاان بطخوں کو ـــــــ ؟ بہت جلد ہی ایک کشتی وہاں نمودار ہوئی جسے چپٹے اور زرد چہرے والے دو شخص چلا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بطخیں جتنی تیزی سے دوڑ سکتی تھیں پانی کو چیرتی ہوئی کشتی کی طرف لپکیں۔ اس تک پہنچیں تو وہ پھدک کر کشتی میں چڑھ گئیں اور ـــــــ آپ اس بات پر یقین کر سکیں گے انہوں نے اپنا اپنا شکار مچھلیوں والی ایک بڑی سی ٹوکری میں ڈال دیا؟ اور پھر مزید شکار لانے کے لیے جھیل میں کود گئیں۔ یہ عمل کم از کم دو گھنٹوں تک جاری رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبتی نژاد برمی مچھیرے جال ڈال کر مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے۔ وہ اپنی بطخوں کی گردنوں کے گرد ایک ڈوری گلا گھونٹنے کی حد تک کس کر باندھ دیتے تھے اور پھر انہیں جھیل پر مچھلیاں پکڑنے کے لیے لے آتے تھے۔ جو کچھ بطخیں پکڑتی تھیں اپنے آقا انسانوں کے پاس پہنچا دیتی تھیں۔ تاہم جب ان کی ٹوکری بھر جاتی تھی تو وہ بطخوں کی گردنوں کے گرد بندھی ڈوریاں کھول دیتے تھے۔ تب وہ پھر جھیل میں ڈبکی لگاتی تھیں اور پیٹ بھر کر مچھلیاں کھاتی تھیں۔

اب ہم ان جھیلوں سے دور ایسے کھیتوں کی تلاش میں اڑ چلے جہاں فصلیں ابھی ابھی کٹی ہوں وہاں ابابیلیں ان کیڑوں پر ٹوٹ پڑیں جو تازہ کاٹ کر رکھے گئے غلّے کے اوپر منڈرا رہے تھے اور انہیں نگلنے لگیں۔ میں نے بھی سیر ہو کر اناج کھایا لیکن کیڑے مکوڑے نہیں۔ چاول کے ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے میں نے ایسی آواز سنی جیسے کوئی کسی چیز کو ٹھوکر مار رہا ہو یہ بالکل ایسی لگی جیسے کوئی چا ئفنچ پرندہ شاہ دانہ کا گودا حاصل کرنے کے لیے اپنی چونچ سے اس کے خول کو چٹخا رہا ہو۔ (کیا یہ انوکھی بات نہیں کہ ایک ننھے سے پرندے کی چونچ کسی سخت پھل کے چھلکے کو چٹخا دینے کی طاقت رکھتی ہو؟) لیکن جب میں ٹہلتا ہوا باڑھ کے نیچے اس جگہ گیا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی تو وہاں میں نے ایک اور پنچھی دیکھا یہ تھا ہمالیائی طوطا (ساریکا)۔ وہ شاہ دانہ کے پوست کو نہیں توڑ رہا تھا بلکہ ایک سست رفتار گھونگھے کے سر کو اپنی چونچ سے ٹھونگے مار رہا تھا۔ ''ٹک ٹیک، ٹک ٹیک۔ ٹیک کرتے ہوئے وہ چوٹ پر چوٹ مارتا رہا حتٰی کہ ان ضربوں سے گھونگھا مر کر بے حس ہو گیا۔ تب طوطے نے اس کا سر اٹھایا پھر اپنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا اپنے پنکھ کھولے۔ تیز نشانہ سادھ کر تین

چوٹیں اور لگائیں ۔ ٹیک۔ ٹیک۔ ٹیک۔ گھونگھے کی کھوپڑی کھل گئی۔ اور لو ایک لذیذ گھونگھا سامنے پڑا تھا۔ گودا اندر سے برآمد ہو گیا۔ اسے اس نے اپنی چونچ میں اٹھایا جس میں سے تھوڑا خون رس رہا تھا۔ لگتا ہے اس نے اپنا منہ قدرے زیادہ کھول دیا تھا، جس سے اس کے منہ قدرے زخمی ہو گئے تھے۔ گھونگھے کو اپنی چونچ میں ٹھیک سے بٹھا کر وہ اڑ گیا اور درخت کی شاخوں میں کھو گیا جہاں رات کے کھانے کے لیے اس کی رفیقِ زندگی انتظار کر رہی تھی۔

سکم کے اناج کے کھیتوں میں ہمارا باقی کا سفر قابلِ یادگار واقعات سے خالی رہا۔ ایک ہی بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ جنگلوں میں ایک مور کو انسان کے ذریعے جال میں پھانسنے کا واقعہ تھا۔ یہ مور غذا اور گرمی کی تلاش میں جنوب کے دلدلی خطوں میں چلے آتے ہیں جب سانپ اور دوسری مخلوقات جوان موروں کی خوراک ہے، اپنی سرمائی پناہ گاہوں میں جا چھپتے ہیں۔

مور اور شیر ایک دوسرے کے مدّاح ہیں۔ مور تو شیر کی کھال کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور شیر مور کے بال و پر کی خوبصورتی سے محظوظ ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ پانی کے پوکھر پر شیر درخت کی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے مور کے پر و بال کو کھڑا تکتا رہے گا اور مور بھی اپنی گردن لمبی کر کے شیر کی دھاری دار کھال کے حسن سے اپنی آنکھیں سینکتا رہے گا۔ آیئے اب اس موقعے پر انسان کی بات کریں جو ازلی جنگجو اور جارحیت پسند ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی اس لیے رنگا ہوا کپڑا لایا جو ہو بہو شیر کی کھال سے مشابہت رکھتا تھا تا کہ اسے دیکھ کہ کوئی بھی پرندہ یہ نہ سمجھے کہ یہ دھاری دار شیر نہیں۔ تب اس نے قریب ہی ایک درخت کی ٹہنی پر پھندا لٹکا دیا اور خود کھسک گیا۔ میں تو رنگے ہوئے کپڑے کی بو سے ہی بھانپ گیا تھا کہ یہ شیر نہیں۔ لیکن مور کے پاس سونگھنے کی حس برائے نام بھی نہیں ہوتی۔ وہ خود ہی اپنی آنکھوں کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند گھنٹوں میں موروں کا ایک جوڑا آیا اور وہ ایک درخت سے مصنوعی شیر کو دھیان سے تکنے لگا اور تکتے تکتے نیچے اور نیچے آ گیا۔ وہ دھوکے سے یہ سمجھ بیٹھے کہ شیر سویا ہوا ہے۔ اس چھلاوے سے ہمت پا کر وہ بہت زیادہ نزدیک آ گئے اور پھندے سے قریب والی شاخ پر آن کھڑے ہوئے۔ اب انہیں اس

پھندے میں پھنس جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن ایک واحد جال میں وہ دونوں کیسے داخل ہو گئے یہ میں سمجھ نہیں پایا۔ جونہی وہ پھندے میں پکڑے گئے انہوں نے بے بسی میں چیخ ماری۔ تب صیّاد سامنے آ گیا اور اس نے ان کے ساتھ ایک اور فریب کیا۔ اس نے ٹاٹ کی دو ٹوپیاں اچھالیں اور انہیں ایک ایک کر کے موروں کے سر پر کس دیا۔ ان میں بے چارے ان پرندوں کی آنکھیں ڈھک گئیں۔ ایک بار جب کسی پرندے کی آنکھوں پر اندھیرا کر دیا جائے تو وہ زیادہ مزاحمت نہیں کر پاتا۔ اب اس آدمی نے ان کے پاؤں باندھ دیئے تاکہ وہ چل نہ سکیں تب اس نے اپنے بانس کے ڈنڈے کے دونوں سروں پر ایک ایک کو باندھ دیا۔ دھیرے سے اس نے ڈنڈے کو درمیان سے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھا اور چل دیا۔ موروں کی لمبی دُمیں شکاری کے آگے پیچھے قوسِ قزح کی صورت میں نیچے لٹک رہی تھیں۔

یہاں میرا معرکہ خیز سفر تمام ہوا۔ اگلے روز میں نے ابابیلوں کو الوداع کہا۔ وہ جنوب کی جانب اور آگے روانہ ہو گئیں۔ اور میں گھر واپس آ کر خوش ہوا۔ اب میں زیادہ عقل مند اور سنجیدہ پرندے کے روپ میں گھر لوٹا تھا۔ اچھا اب مجھے یہ بتایئے رنگیلا نے مطالبہ کیا۔ ''کہ پرندے اور حیوانات ایک دوسرے کو اتنی اذیت کیوں پہنچاتے ہیں؟ اور اتنا قتل و غارت گری کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں آپ سب انسان ایک دوسرے کو اس قدر ایذا نہیں پہنچاتے —— پہنچاتے ہیں کیا؟ لیکن پرندے اور جانور تو پہنچاتے ہیں۔ اس سب سے میں بہت رنجیدہ ہوں۔''

حصۂ اوّل ختم
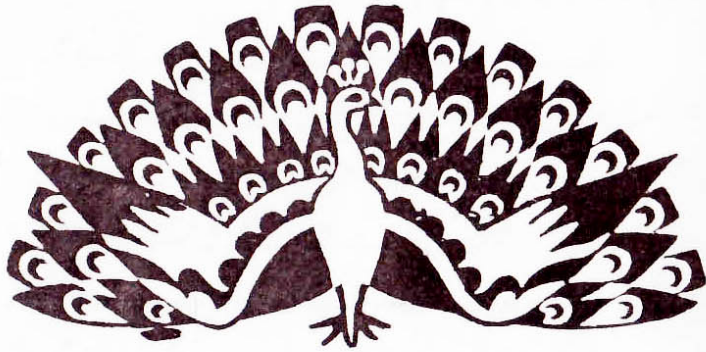
حصۂ دوم

جنگ کے لیے رنگیلے کی تربیت

جب ہم شہر واپس آئے تو یوروپ میں کہیں جنگ چھڑ جانے کی افواہ گرم تھی۔ اب جبکہ موسمِ سرما قریب تھا میں نے فیصلہ کیا کہ رنگیلا کو ایسی تربیت دوں جو اُسے لازماً درکار ہوگی اگر برطانیہ کے محکمہ جنگ کی طرف سے اُسے پیغام رسانی کا کام سپرد کیا جائے۔ چونکہ وہ شمال مشرقی ہمالیہ کی آب و ہوا کا عادی ہو چکا تھا وہ یوروپ کے دیشوں میں فوجوں کے لیے ایک بیش قیمت پیغام رساں ثابت ہوگا۔ آج بھی جبکہ بے تار برقی، ٹیلی گراف اور ریڈیو کی خدمات دستیاب ہیں کسی بھی فوج کے لیے پیغام رساں کبوتروں کی مدد ناگزیر ہے۔ جب موجودہ کہانی کے واقعات آپ پر کھلیں گے تو یہ سب کچھ آپ پر واضح ہو جائے گا۔

جنگ کے کام کے لیے پیغام رساں کبوتروں کی تربیت کے لیے میں نے اپنے ہی اصل منصوبے پر عمل کیا جس کو گھونڈ کی بھی منظوری حاصل تھی۔ قطع کلام کے لیے معاف کیجیے وہ بزرگ اتنی دور شہر تک ہمارے ہمراہ ہی آ گیا تھا۔ دو تین روز وہ ہمارے گھر پر ٹھہرا۔ تب اس نے یہ کہہ کر رخصت لی ''شہر ناقابلِ برداشت ہے۔ میں نے کبھی کسی شہر کو پسند نہیں کیا لیکن اس شہر میں تو مجھے بجلی کی ٹراموں اور ہوا گاڑی سے ڈر لگتا ہے یعنی موٹروں سے۔ اگر میں جلد ہی اس شہر کی گرد اپنے پیروں سے نہیں جھاڑ پھیکوں گا تو میں ایک بزدل سے زیادہ کچھ نہ رہ پاؤں گا۔ جنگل میں مجھے

شیر سے اتنا ڈر نہیں لگتا۔ لیکن میں موٹر گاڑی کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ خطرناک ترین جنگل کے مقابلے میں کسی جدید شہر کا ایک چوراہا ایک منٹ میں جتنی جانوں کو خطرے میں ڈال سکتا ہے، اتنی تو خطرناک ترین جنگل ایک پورے دن میں بھی نہیں ڈالتا۔ خدا حافظ! میں وہیں جارہا ہوں جہاں جنگل خاموشی کا لباس پہنے رہتے ہیں۔ ہوا گردوغبار اور بدبو سے پاک ہے اور آسمان ایک خالی فیروزہ سہی مگر اسے کھمبے اور ٹیلی گراف کے تار بیچ سے نہیں کاٹتے۔ کارخانوں کی سیٹیوں کے بجائے میں پرندوں کے راگ سنوں گا اور چوروں اور بندوق بردار سنتریوں کی جگہ میں معصوم شیروں اور تیندوؤں کو آمنے سامنے دیکھوں گا۔ خدا حافظ!

لیکن رخصت ہونے سے پہلے گھونڈ نے چالیس مزید پیغام رساں نسل کے اور کچھ ٹمبلر نسل (گرہ باز لوٹن کبوتر) کبوتر خریدنے میں میری مدد کی۔ آپ ان دو نسلوں کو ترجیح دینے کا سبب مجھ سے پوچھیں گے۔ یہ تو میں نہیں سمجھتا کہ مجھے ٹمبلر (لوٹن کبوتر) اور پیغام رساں کبوتروں ہی سے کلی طور پر مجھے پیار ہے لیکن یہ بات بالکل صحیح ہے کہ فین ٹیل پاؤٹر اور دیگر نسلوں کے کبوتر اتنے کارآمد نہیں ہوتے جتنے وہ صرف نمائشی ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ان اقسام کے کچھ کبوتر موجود تھے لیکن ان کو پیغام رساں اور مسافر نسل کے کبوتروں کی رفاقت میں رکھنا اس قدر مشکل ثابت ہوا کہ میں آخرکار خالص ڈائر نسل کے (رنگین کبوتر) کبوتروں کا مداح بن گیا۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک عجیب رواج ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ کوئی پیغام رساں کبوتر فروخت کرتے ہیں تو وہ چاہے کتنی بھی مہنگی قیمت پر بیچیں، تو بھی وہ اپنے نئے مالک کے گھر سے اڑ کر واپس آپ کے پاس آجائے گا۔ یہ پھر آپ کی ملکیت بن جاتا ہے اور خواہ کتنی بھی اس کی قیمت ہو آپ ہرگز وہ قیمت واپس نہیں کرتے۔ کبوتروں کے شائقین کے ہاں یہ مسلّمہ رواج ہے۔ یہ جانتے ہوئے مجھے اپنے نئے خریدے ہوئے کبوتروں کو دوسری اور باتوں سے پہلے تو یہ تربیت دینی تھی کہ وہ مجھ سے پیار کریں۔ چونکہ میں نے ان کی قیمت ادا کی تھی، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے سابقہ مالکوں کے پاس واپس چلے جائیں۔ میں نے جی توڑ کوشش کی کہ

وہ اپنے نئے گھر کی وفاداری سے خدمت کریں۔ میرے لیے بھی عملی طور پر کچھ کرنا ضروری ہے۔ مجھے نہایت احتیاط سے اپنا منصوبہ شروع کرنا پڑا۔ پہلے چند ہفتوں تک تو مجھے ان کے پنکھ باندھ کر رکھنے پڑے تاکہ وہ مکمل طور پر ہماری چھت کی حدود کے اندر رہیں۔ کبوتر کو اڑنے سے روکنے کے لیے اُس کے پنکھ باندھنا بڑا نازک فن ہے۔ آپ ایک تاگا لے کر اُس کا ایک سرا ایک پنکھ کے اوپر سے گزارتے ہیں، پھر اس سرے کو اگلے پنکھ کے نیچے سے اُس پنکھ کی جڑ کے بالکل قریب سے گزارتے ہیں اور اس ترتیب سے اسے آخری پنکھ تک لے جاتے ہیں کہ سارے پنکھ ہی اس میں پروئے جاتے ہیں۔ پھر آپ تاگے کا دوسرا سرا پہلے پنکھ کے نیچے اور پھر دوسرے پنکھ کے اوپر سے اسی ترتیب سے گزار کر پنکھوں کے آخر تک لے آتے ہیں، جہاں تاگے کے دونوں سروں کو آپس میں باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ بالکل رفوگری جیسا کام ہوتا ہے۔ یہ قیدی بنا کر رکھنے کا ایسا طریقہ ہے جس سے تکلیف کم پہنچتی ہے چونکہ یہ کبوتر کو اڑنے سے تو روکے رکھتا ہے لیکن اسے کھولنے اور پھڑ پھڑانے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد میں انہیں اپنے کبوتروں کی چھت کے الگ الگ گوشوں میں رکھتا تھا تاکہ وہ خاموشی سے بیٹھے رہیں اور اپنے نئے گردوپیش کا رنگ اور خصوصیت کو اپنی آنکھوں میں بسا لیں۔ اس کارروائی کے لیے کم از کم پندرہ دن وقف کرنے چاہئیں۔

یہاں رنگیلے کی ایک مکاری کا ذکر ضرور کردوں جو اس نے تب کی تھی جب اس کے پنکھ اسی ترتیب سے باندھے گئے تھے۔ میں نے اسے نومبر کے آغاز میں بیچ دیا تھا محض یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا وہ میرے پاس واپس آئے گا جب اس کے پنکھ تاگوں کی زنجیر سے آزاد کردیئے جائیں گے۔

اور واقعی رنگیلا کو خریدنے کے دو ہی دن بعد اُس کا نیا مالک میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ رنگیلا بھاگ گیا ہے۔

میں نے دریافت کیا "وہ کیسے؟"

''میں نہیں جانتا لیکن وہ میرے گھر میں مجھے نہیں ملا''

''کیا تم نے اُس کے پنکھ باندھ دیئے تھے؟ کیا وہ اُڑ سکتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس کے پنکھ تو باندھ دیئے تھے'' اُس نے جواب دیا۔

یہ سن کر میری روح کانپ گئی۔ میں نے کہا ''اے اونٹ کے بھائی او گدھے کے چچا! بجائے میرے پاس بھاگے آنے کے تم نے اسے پڑوس میں ڈھونڈا ہوتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس نے اڑنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس کے پنکھ چونکہ بندھے ہوئے تھے وہ چھت سے نیچے گر پڑا ہوگا۔ اب تک تو اسے کسی بلّی نے مار کر نگل لیا ہوگا۔ آہ! یہ تو ایک کبوتر کا قتل ٹھہرا۔ تم نے تو عالمِ انسانیت کو پیغام رساں کبوتروں کے ایک سرتاج سے محروم کر دیا ہے۔ تم نے تو کبوتروں کے مقام و مرتبہ کی شوکت کو قتل کر ڈالا۔'' میں نے اسے اِس طرح کھری کھری سنائی۔

میرے الفاظ نے اس شخص کو اس قدر بری طرح خوف زدہ کیا کہ اس نے مجھ سے ہمراہ چل کر رنگیلا کو ڈھونڈھنے کے لیے گزارش کی۔ مجھے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اُس بے چارے کبوتر کو بلّیوں سے بچایا جائے۔ ہم نے بعد دوپہر پورا دن اس کی تلاش میں گزارا لیکن بے سود۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی خارش زدہ بلّی کے ہاتھ لگے۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی آس میں ان بارہ گھنٹوں ہی میں شہر کی اتنی تنگ گلیاں چھان ماریں جتنی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں گھومی ہوں گی۔ اُس رات میں گھر دیر سے لوٹا جس کی وجہ سے مجھے خوب ڈانٹ پڑی اور میں ایک دل شکستہ لڑکے کی ذہنی کیفیت میں بستر پر دراز ہوگیا۔

میری ماں جو میری ذہنی حالت کو سمجھتی تھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں نیند کی دنیا میں چوٹ اور دکھ کے احساس کے ساتھ قدم رکھوں۔ اُس نے کہا ''تمہارا کبوتر صحیح سلامت ہے تم سکون کے ساتھ بستر پر سو جاؤ''

''ماں!''

اُس نے جواب دیا ''اگر تم شانت ہو گے تو تمہارے پرسکون خیالات تمہاری مدد

کر سکتے ہیں۔ اگر تم پرسکون ہو گے تو تمہارا اطمینانِ خاطر اُسے بھی سنجیدہ بنائے گا اور اگر وہ مطمئن ہوگا تو اُس کا ذہن صحیح کام کرے گا۔ اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ رنگیلے کا ذہن کتنا تیز ہے۔ اگر وہ سکون کے ساتھ کام پر لگے گا تو وہ تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے صحیح سلامت گھر پہنچ جائے گا۔ آؤ اُس ابدی ذاتِ رحیم سے دعا کریں اور خود کو شانت رکھیں۔ چنانچہ ہم رات کی خاموشی میں گھرے ہوئے نصف گھنٹہ تک بیٹھے رہے اور یہ کہتے رہے۔ ''میں مطمئن ہوں۔ سبھی موجودات مطمئن ہیں۔ سبھی کو شانتی سبھی کو سکون عطا ہو۔ اوم شانتی! شانتی! شانتی!

جب میں سونے لگا میری والدہ نے فرمایا ''اب تمہیں کوئی برا خواب نہیں آئے گا، اب جب تمہارے دل میں پرماتما کی شانتی اور دیا بیدار ہو گئے ہیں تمہیں سکون کی رات نصیب ہوگی۔ شانتی!''

اس میں شک نہیں کہ یہ واقعی بارآور ثابت ہوئی چونکہ صبح لگ بھگ گیارہ بجے رنگیلا آسمان میں اڑتا نظر آیا۔ وہ بہت اونچائی پر تھا۔ اس نے اپنے پنکھوں کو بندھن سے کیسے چھڑایا، یہ مجھے اس کی اپنی ہی بولی میں آپ کو سنانا پڑے گا۔ آیئے پھر تصور کریں۔

ہماری چھت پر آ کر رنگیلا نے یوں اپنا بیان شروع کیا ''اے بہت سی بولیوں کے عالم! میں اس آدمی کے گھر میں ایک دن سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔ اس نے مجھے کیڑوں مکوڑوں کا کھایا ہوا اناج کھانے کو دیا اور پینے کو باسی پانی۔ آخر کار میں بھی ایک روح ہوں۔ میرے ساتھ کیوں ایک ٹھیکرے کا سا سلوک روا رکھا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے میرے پنکھ مچھلی پکڑنے والی بدبودار ڈوری سے باندھ دیا۔ کیا میں ایسے شخص کے پاس ٹھہر سکتا تھا؟ کبھی نہیں۔ لہٰذا وہ مجھے اپنے گھر کی سفید چھت پر رکھ کر ابھی مشکل سے زینے سے اترا ہی تھا کہ میں نے اپنے پنکھ پھڑپھڑائے اور راز آیا۔ افسوس کہ میرے پنکھ بھاری تھے۔ اس لیے اڑتے ہوئے مجھے چوٹ آ گئی اور میں نزدیک کی ایک گلی میں واقع ایک دکان کے شامیانے پر گر پڑا۔ وہاں میں مدد کی آس لگائے انتظار میں بیٹھا رہا۔ میں نے کچھ ابابیلوں کو گزرتے دیکھا تو انہیں آواز دی لیکن وہ میری دوست ابابیلیں نہیں

تھیں۔ مجھے ایک جنگلی کبوتر نظر آیا۔ اسے بھی میں نے پکارا لیکن اُس نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ عین اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کالی بلّی میری جانب آرہی ہے۔ اب موت صرف چار فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ جب یہ اور قریب آرہی تھی تو اُس کی پکھراجی زرد آنکھیں لال انگارہ سی ہوگئیں۔ وہ دبک کر مجھ پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میں بھی اچھلا اور اس کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا شامیانے سے کوئی پانچ فٹ اونچے کنگرے پر پہنچ گیا جہاں ایک ابابیل نے گھر بنا رکھا تھا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل تھا پھر بھی میں اسی جگہ سے چمٹا رہا جب تک کہ وہ سیاہ فام بلی وہاں سے چلی نہیں گئی۔ اب میں نے جست لگائی۔ مجھ سے چار پانچ فٹ اوپر چھت تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ میرے پنکھ زخمی تھے۔ درد کو کم کرنے کے لیے میں نے اپنی چونچ سے پنکھوں کی جڑوں کو سہلایا۔ میری چونچ نے ایک ایک کر کے پنکھوں کو دبایا اور ان پر مالش کی اور تب کوئی چیز پھسلی۔ یہ ایک چھوٹا سا پنکھ تھا جسے میں دبا دبا کر اُس مچھلی پکڑنے والی اُس انتہائی بدبودار رسّی سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اُس سے اگلے پنکھ کو میں نے مسلسل رگڑا اور دبایا۔ اور لو یہ بھی رسی سے چھوٹ گیا۔ جلد ہی پنکھ کھل گیا عین اسی وقت وہ کالی بلّی پھر سے چھت پر نمودار ہوگئی لیکن اب میں کوئی دس فٹ تک اڑ پایا اور ایک اونچی عمارت کے کنگرے پر پہنچ گیا جہاں مجھے بیٹھنے کو ایک آرام دہ جگہ مل گئی۔ وہاں بیٹھے ہوئے میں نے اُس قاتل بلّی پر نگا ڈالی۔ وہ کمٹی اور مچھلی پکڑنے والی اُس رسّی پر جھپٹ پڑی جسے میں نے ابھی ابھی اپنے پنکھوں پر سے اتار پھینکا تھا۔ اِس سے مجھ پر نئی کہانی کا انکشاف ہوا۔ دراصل یہ مچھلی پکڑنے والی اُس رسّی کی بو تھی جسے سونگھ کر بلّی کھنچی چلی آئی تھی نہ کہ میرے لئے۔ اب اس کے بعد میں اس تاگے کو دبانے اور کاٹنے لگا جس سے میرا دوسرا پنکھ بندھا ہوا تھا۔ جب تک میں نے اپنے آدھے بال و پر چھڑائے، تب تک رات پڑ گئی اور جب میں نے اپنے آخری بدبودار بندھن کو اتار پھینکا، مجھے اڑ کر گھر آنے کے لیے مجبوراً صبح صادق تک انتظار کرنا پڑا۔ چونکہ صبح بہت سویرے دھند لکے میں الّو اڑتے رہتے ہیں اور اُس کے بعد باز آدھمکتے ہیں۔ لیکن میں تو ہوا میں سے محفوظ راستہ چاہتا تھا۔ لیجئے اب میں گھر پہنچ گیا ہوں اور بھوکا

بھی ہوں اور پیاسا بھی۔''

میں اپنے نئے کبوتروں کے لیے سب سے پہلا کام یہ کرتا تھا کہ انہیں کھانا دیتا تھا اور پینے کو تازہ پانی۔ میں انہیں کبھی وہ پانی نہیں پینے دیتا تھا جس میں وہ نہاتے تھے۔ چونکہ رنگیلے کے پنکھوں سے مچھلی کی بو آرہی تھی، میں نے اسے دوسرے کبوتروں سے الگ ڈربہ دے دیا۔ تین دن کے انتظار اور تین بار اچھی طرح غسل کرانے کے بعد کہیں جا کر رنگیلا کسی شائستہ سوسائٹی کے لائق ہوا۔ برسبیل تذکرہ میرے والد صاحب نے مجھ سے اُس شخص کو اُس کی رقم واپس ادا کروادی جس نے رنگیلے کو خریدا تھا اور جسے یہ تلخ نتائج بھگتنے پڑے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں رقم واپس نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل کر کے میں نے اچھا ہی کیا۔

ایک پکھواڑے کے بعد اور ان کے بندھے ہوئے پنکھوں کو کھولنے سے پہلے میں نے اپنے نئے خریدے ہوئے کبوتروں کو لالچ دیا تاکہ وہ مجھ سے پیار کریں۔ ہر صبح میں باجرے اور مٹر کے دانے گھی میں ڈال دیتا۔ سارا دن وہ دانے اس میں بھیگے رہتے تب میں اپنے ہر ایک کبوتر کو بارہ بارہ دانے کھلاتا۔ وہ اس لذیذ کھانے کے ایسے مشتاق ہو گئے کہ دو دنوں ہی میں انہیں یہ عادت پڑ گئی کہ شام پانچ بجے سے پہلے وہ میرے پاس آتے اور گھی میں سنے ہوئے دانوں کے لیے التجا کرتے۔ تین دنوں میں، میں نے ان کے پنکھ بڑی ہوشیاری سے کھول دیئے۔ ایسا میں نے پانچ بجنے سے پندرہ منٹ پہلے کیا۔ جونہی انہوں نے خود کو آزاد پایا اسی پل وہ سب اڑنے لگے۔ لیکن یہ لیجئے، اپنی آزادی کی خوشی کا تازہ ترین جوش ٹھنڈا ہوا تو وہ واپس اڑ کر چھت پر آگئے مکھن میں سنے ہوئے مٹر اور باجرے کے دانوں کا مزہ چکھنے کے لیے۔ شرم کی بات ہے کہ ہمیں اپنے کبوتروں کا پیٹ بھر کر ان کا اعتماد حاصل کرنا پڑتا ہے لیکن افسوس! میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے مرد اور عورتیں بھی اس اعتبار سے کبوتروں جیسے ہی ہیں۔

جنگی تربیت (جاری)

جوں جوں دن گزرتے گئے وہ پالتو کبوتر رفتہ رفتہ ہمارے گھر سے دور، بہت دور تک اڑنا سیکھتے گئے۔ ایک مہینہ ختم ہوتے ہوتے انہیں پچاس میل اور اس سے زائد فاصلے پر پنجرے سے آزاد کیا گیا تو صرف دو کو چھوڑ کر، جو لگتا ہے کہ اپنے سابق مالک کے پاس بھاگ گئے، باقی سبھی رنگیلا کی سربراہی میں میرے پاس آ گئے۔

غیر متنازعہ لیڈر شپ کا مسئلہ حل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دراصل اس کے لیے رنگیلے کو دو نئے کبوتروں کے ساتھ ایک بڑی سنجیدہ لڑائی لڑنی پڑی۔ یہ تھے ہیرا اور جوہر۔ دوسرے نمبر والا خالص سیاہ ٹمبلر نسل کا کبوتر تھا۔ اس کے پروبال چیتے کی کھال کی طرح چمکتے تھے۔ لیکن وہ نرم مزاج تھا۔ لیکن اس نے پورے غول پر رنگیلا کی سرداری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پیغام رساں کبوتر کتنے جھگڑالو اور نمائش پسند ہوتے ہیں۔ میری چھت پر سبھی نر پیغام رساں کبوتر اس طرح اکڑ کر چلتے اور غٹرغوں کرتے ہوئے باہم بات چیت کرتے تھے جیسے ہر ایک اپنی نگاہ میں آنے والی ہر شے کا بادشاہ ہو۔ اگر رنگیلا خود کو نپولین سمجھتا تھا تو سفید رنگ والا ہیرا نامی کبوتر جسے شاعری کی زبان میں ''سورج کی روشنی کا دل و جگر'' کہا جائے، اپنے آپ کو سکندرِ اعظم سمجھتا تھا جبکہ جوہر (کالا ہیرا) جو پیغام رساں کبوتر نہیں تھا، سب کو معلوم رہے کہ خود کو جولیس سیزر اور مارشل

حاک دونوں کا مرکب تھا۔ ان تینوں کے علاوہ بھی کئی اکڑفوں کبوتر تھے لیکن وہ سب لڑائی میں ان تینوں میں سے کسی نہ کسی سے مار کھا چکے تھے۔ اب سارے جھنڈ کی واحد اور قطعی لیڈر شپ کا فیصلہ لڑ کر ہونا تھا۔

ایک دن ہیرا کو بیگم جوہر کی موجودگی میں اپنے پنکھ سہلاتے اور خرافات بکتے دیکھا گیا۔ بیگم جوہر سُرمے جیسی سیاہ فام حسینہ اور مانک جیسی سرخ آنکھوں والی کبوتری تھی۔ ابھی بات زیادہ نہیں بڑھی تھی کہ جوہر کہیں سے وہاں ٹپک پڑا اور ہیرا پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس قدر طیش میں آ گیا کہ وہ ایک جانی دشمن کی طرح لڑنے لگا۔ چونچوں سے چونچیں لڑیں اور پاؤں سے پاؤں اور پنکھوں کے مقابلے میں پنکھ۔ دوسرے سبھی کبوتر اس اکھاڑے سے بھاگ لیے جہاں یہ دونوں نر کبوتر ایک دوسرے کو بری طرح زخمی کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ رنگیلا وہاں بڑے اطمینان سے یوں سنجیدہ ہو کر ان کے سر پر کھڑا تھا جیسے ٹینس کے میچ میں امپائر۔ آخر کار کوئی چھ کشتیوں کے بعد ہیرا جیت گیا۔ اپنے غرور کی انتہائی حد تک پھولا ہوا وہ جوہر کی بیوی کے پاس جا کر بولا۔ ''محترمہ! آپ کا شوہر بزدل ہے۔ دیکھ لیجیے میں کتنا تگڑا ہوں۔ غٹرغوں، غٹرغوں''۔ اس کبوتری نے ہیرا پر ایک حقارت بھری غضبناک نگاہ ڈالی اور پنکھ پھڑپھڑاتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ ڈربے میں چلی گئی۔ اس پر ہیرا کو لگا جیسے اس کی کلغی گر گئی ہو اور وہ کھسیانہ سا ہو گیا۔ پھر غصّے سے اچانک وہ رنگیلا پر ٹوٹ پڑا۔ رنگیلا اس غیر متوقع حملے سے بے خبر تھا، اس لیے وہ ہیرا کے پہلے غضبناک وار سے لگ بھگ چت ہو چلا تھا۔ ہیرا نے اسے ٹھونگے لگائے اور پھر چپت جمائی حتیٰ کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کے لیے کھڑا رہنا محال ہو گیا اس لیے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ پاگل ہیرا نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ دو لٹوؤں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے دائرے میں گھومتے رہے۔ اب تو مجھے یہ بھی جاننا مشکل ہو رہا تھا کہ کون پیچھا کرنے والا ہے اور کس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ وہ اتنی تیز رفتار سے بھاگ رہے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب رک کر ایک دوسرے کے ٹھونگے اور تھپڑ مارنے لگے۔ پنکھوں کے باہم بھڑنے کی دھماکہ خیز آواز فضا میں ایک منحوس ہنگامہ پیدا کر رہی تھی۔ اب ہر طرف پروبال

بکھرنے لگے۔ دفعتاً چونچ سے چونچ اور پنجہ سے پنجہ بھڑاتے ہوئے وہ دونوں گتھم گتھا ہوکر فرش پر لڑھکنے لگے۔ اب دو پرندے غصّے کا ایک پیکر بنے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس طرح سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پارہا رنگیلے نے خود کو اپنے حریف کی گرفت سے چھڑالیا اور ہوا میں اڑ گیا۔ ہیرا نے بہت تیزی سے اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتے ہوئے اُس کا پیچھا کیا۔ فرش سے لگ بھگ تین فٹ اوپر رنگیلا نے اپنے پنجے ہیرا کے گلے کے اوپر کسی عقاب کے پنجوں کی طرح گاڑ دیئے اور اسے زیادہ سے زیادہ کس کر مروڑنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پنکھوں کی مار سے خوفناک گولہ باری جاری رکھی۔ جنھوں نے فولاد کے موسل کی طرح اپنے حریف کے جسم سے برف رنگے سفید پر توڑ کر ان کی بوچھاڑ لگا دی۔ اب گرتے ہوئے پروں کے طوفان میں ڈھکے ہوئے دونوں دو پاگل سانپوں کی زہریلی غضبناکی کے ساتھ ایک دوسرے کو ٹھونگے مارتے ہوئے فرش پر لوٹنے لگے۔ آخر کار ہیرا نے ہار مان لی اور ایک پھٹے حال سفید پھول کی طرح فرش پر جھک گیا۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی سرک گئی تھی۔ جہاں تک رنگیلے کی بات ہے اس کے حلق اور گردن پر اب مشکل سے کوئی بال و پر بچا ہوگا۔ تاہم وہ خوش تھا کہ اس تنازعے کا یکبارگی فیصلہ تو ہو گیا۔ چاہے اِدھر یا اُدھر۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ہیرا نے اپنی آدھی طاقت جوہر کے ساتھ لڑنے میں نہ خرچ کی ہوتی تو وہ یہ لڑائی نہ جیت پاتا۔ چلئے انت بھلا سو بھلا۔ میں نے ہیرا کی ٹانگ پر مرہم پٹی کی اور بھی جو کچھ ضروری تھا وہ کیا۔ اگلے تیس منٹوں میں سارے کے سارے کبوتر دن کا آخری کھانا کھا رہے تھے اور وہ بھول چکے تھے جو ابھی ابھی ہوا تھا۔ ان کے خون میں رنجیدگی اور کینہ پالنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ اعلیٰ نسل کے پرکھوں کی اولاد تھے۔ اچھے سنسکاران میں چھوٹے سے چھوٹے کبوتر میں بھی موجود تھی۔ مزید بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہیرا نے اپنی شکست کو بھی ایک شریف شخص کی طرح قبول کیا۔

تب تک جنوری کا مہینہ آ گیا تھا۔ موسم ٹھنڈا اور آسمان بادلوں سے پاک ہونے کے باعث کبوتروں کے انعامی مقابلے شروع ہو گئے۔ ہر آدمی کے کبوتروں کے جھنڈ کی تین پہلوؤں

سے آزمائش کی جاتی تھی۔ ٹولی میں یکجہتی سے کام کرنا، لمبے فاصلے کی اڑان اور خطرات تلے اڑان۔ ہم کو پہلی مد میں اوّل انعام ملا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک ناگوار حادثے کے باعث، جس کے متعلق آپ کو صحیح موقعہ پر پتہ چل جائے گا، میرے کبوتر دوسرے دو شعبوں میں مقابلہ نہ جیت سکے۔

ٹولی میں یکجہتی سے کام کرنے کے مقابلے کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے۔ کبوتروں کی مختلف ٹولیاں اپنے اپنے گھروں سے کافی اونچا اڑتی ہیں۔ جب وہ سیٹی کی آواز اور دوسری ایسی آوازوں، جو ان کے مالکوں کی نشان دہی کرتی ہیں، کی رسائی کی حد سے آگے نکل جاتی ہیں، تو وہ مختلف ٹولیوں میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ تب اپنے آپ ہی وہ کسی ایک کبوتر کی سربراہی میں اڑنے پر متفق ہو جاتی ہیں، جسے وہ صحیح طور پر قابل سمجھتی ہیں۔ یہ سب کچھ اوپر ہوا میں ہی ہوتا ہے جہاں کبوتر کی حاضر دماغی اور جبلّت کام آتی ہے۔ اور جو پرندہ ٹولی کے آگے اڑتا ہے اور جسے ٹولی کی سربراہی کرنے کو کہا جاتا ہے، وہی ایسا کرتا ہے لیکن اُسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُسے یہ اعزاز عطا کیے جانے کا سبب کیا ہے اور اس کی نوعیّت کیا ہے۔

درجہ حرارت گر کر پینتالیس تک آ گیا۔ ہندوستان کے جس حصّے میں ہم رہتے ہیں، وہاں یہ ایک بہت سہانی موسمِ سرما کی صبح تھی۔ حقیقت میں یہ سال کا سب سے ٹھنڈا دن تھا۔ اوپر آسمان بادلوں سے خالی اور گہرا تھا، غیر محسوس نیلگوں —— جیسا کہ عموماً موسمِ سرما میں ہوتا ہے۔ شہر کے مکانات —— گلابی، نیلے، سفید اور زرد رنگ کے —— یوں دکھائی دیتے تھے جیسے صبح کے رنگ برنگے عمیق پاتال سے بڑے دیوؤں کا لشکر نکل رہا ہو۔ دور اُفق ارغوانی اور بھورے رنگ کی دُھند میں جلتا دکھائی دے رہا تھا۔ پیلے اور نیلے کپڑوں میں ملبوس مرد اور عورتیں اپنی صبح کی پوجا کے بعد اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے، سورج کی حمد و ثنا میں منہمک اپنے بازو اوپر اُٹھائے ہوئے تھے۔ شہر میں شور و غل تھا۔ ہوا چیلوں اور کوّوں کی آوازوں سے بھر رہی تھی۔ اس شور شرابے میں بانسری بجانے والوں کی تان سنائی دے جاتی تھی۔ ایسے وقت میں ''تیار ہو جاؤ'' کی سیٹی سے

اعلان ہوا کہ مقابلہ شروع ہو گیا اور ہر کبوتر باز نے اپنی اپنی چھت سے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ اُسی وقت کہیں سے کبوتروں کے بے شمار غول آسمان کی جانب اٹھے۔ ٹولی کے بعد ٹولی، ایک رنگ کے بعد دوسرے رنگ کی —— ان کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پنکھ انہیں شہر سے اونچا لے چلے۔ کوّے اور لال نیز بھوری نسلوں کی چیلیں آسمان سے بھاگ کھڑی ہوئیں جب انہوں نے آسمان پر دسیوں ہزار پیغام رساں اور ٹمبلر (لوٹن کبوتر) نسلوں کے کبوتروں کی یلغار دیکھی۔ جلد ہی یہ جھنڈ، جن میں سے ہر ایک پنکھے کی شکل میں اڑتا دکھائی دیتا تھا، آسمان میں چکّر لگانے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ بے شمار بادل ہوا کے بھنور میں پھنس گئے ہیں حالانکہ ہر لمحہ وہ اور اونچا چڑھتے جاتے تھے، پھر بھی کافی دیر تک ہر جھنڈ کا مالک اپنے جھنڈ کو دوسرے جھنڈ سے الگ پہچان سکتا تھا، یہاں تک کہ آخر کار وہ الگ الگ جھنڈ ایک دوسرے میں سما کر ایک واحد جھنڈ بن گئے اور پنکھوں کی ایک ٹھوس دیوار کی شکل میں اڑنے لگے۔ میں پھر بھی ان کے اڑنے کے ڈھنگ سے شناخت کر سکتا تھا کہ یہ رنگیلا ہے یا ہیرا یا جوہر یا آدھا درجن دوسرے ناموں والے کبوتر۔ ہر پرندے کے کچھ ذاتی اوصاف بھی تھے جو اڑنے کے دوران بھی اس کی پہچان قائم رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی مالک اپنے کبوتر کی توجہ اپنی جانب موڑنا چاہتا، وہ اپنے منہ سے تھوڑا رُک رُک کر سیٹی بجاتا تھا جو اس مخصوص کبوتر کے لیے ہدایتی اشارہ ہوتا تھا۔ اگر کبوتر اس آواز کی پہنچ کی حد میں ہوتا تھا تو اس کی توجہ مالک کی ہدایت کی طرف مبذول ہو جاتی تھی۔

آخر کار یہ جھنڈ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ کبوتروں کا کوئی مالک تُرہی بھی پھونکے تو آواز اس کے کبوتر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اب انہوں نے آسمان میں چکّر کاٹنا بند کر کے اُفق کے متوازی اڑنا شروع کر دیا۔ اب سرداری کے لیے مقابلہ شروع ہو گیا۔ جب وہ آسمان کی ایک سمت سے دوسری سمت کو اڑنے کی مختلف چالیں چل رہے تھے، ہم مالکان نیچے کھڑے بڑے غور سے اس کبوتر کے اوصاف کا جائزہ لے رہے تھے۔ جس پر کبوتروں نے اڑان کی قیادت کی ذمّہ داری سونپی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ایسا لگا کہ میرا جوہر اڑان کی لیڈر شپ کرے گا۔ لیکن وہ مشکل سے جھنڈ کے

اگلے سرے تک پہنچا تھا کہ وہ سب دائیں جانب مڑ گئے۔ اس سے ان کی صفوں میں کچھ افراتفری سی مچ گئی اور گھوڑ دوڑ میں دوڑنے والے گھوڑوں کی صورت ہر قسم کے انجانے کبوتر دھکا پیل کر کے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن تھوڑی دیر میں ہر ایک کو باقی کے غول نے نیچے دھکیل دیا۔ ایسا اتنی بار ہوا کہ مقابلے میں ہماری دلچسپی ختم ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی غیر اہم انجانا کبوتر لیڈر شپ کا وہ من چاہا انعام جیتے گا۔

تبھی اچانک بہت سے مکانوں کی چھت سے آواز اٹھی ''رنگیلا۔ رنگیلا۔ رنگیلا'' جی ہاں بہت سے کبوتر باز وہی نام پکار رہے تھے۔ اب تو میں نے دیکھا اِس میں کسی غلطی کا شائبہ بھی نہیں کہ میرا ہی کبوتر اس عظیم غول کی قیادت کر رہا تھا، وہ لیڈروں کا بھی لیڈر —— اس جھنڈ کی چالوں کی جہت نمائی کر رہا تھا۔ واہ! کتنا شاندار اور پُر شوکت تھا وہ لمحہ —— وہ اُفق تا اُفق ان کی سربراہی کر رہا تھا، انہیں ہر بار چند فٹ مزید بلندی پر لے جاتا ہوا۔ حتٰی کہ صبح کے آٹھ بجے تک کوئی ایک بھی کبوتر آسمان کے کسی گوشے میں نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے جھنڈے لپیٹ لیے اور زینے سے اتر کر اپنے سبق پڑھنے بیٹھ گئے۔ دوپہر کو جب ہم پھر اوپر گئے تو ہر شخص کبوتروں کے جھنڈ کو نیچے اترتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ لیجئے رنگیلا اب بھی اس جھنڈ کی قیادت کر رہا تھا۔ پھر سے وہی نعرہ گونج اٹھا ''رنگیلا —— رنگیلا''۔ جی ہاں اُس نے مورچہ جیت لیا تھا چونکہ چار گھنٹوں سے زائد عرصے تک اُس نے جھنڈ کی سرداری کی تھی اور اب اُسی طرح نیچے اتر رہا تھا جس طرح وہ اوپر کی جانب اڑا تھا —— واہ رے مشاق!

اب اڑان کا سب سے خطرناک مرحلہ درپیش تھا۔ اس لمبے چوڑے اجتماع کے کمانڈر نے سب کو الگ الگ ہو جانے کا حکم دیا۔ اب ایک کے بعد ایک ٹولی، مجموعی جھنڈ سے الگ ہونے لگی۔ ہر الگ الگ ٹولی اپنے اپنے گھر کی جانب اڑ چلی۔ لیکن ایسا بہت جلدی میں نہیں ہوا۔ کچھ کبوتروں کو آسمان میں رکھوالی کرنی ہوتی ہے جبکہ باقی کبوتر اپنے گھروں کی جانب اترتے ہیں۔ رنگیلا نے میرے چھوٹے سے غول کو ایک چھتری کی شکل میں آسمان میں ٹکائے رکھا تاکہ مقابلے

میں شامل دوسرے لوگوں کی لوٹتی ہوئی ٹولیوں کا عقبی حصہ بھی سلامتی سے اتر جائے۔ سرداری کی یہ قیمت تو چکانی پڑتی ہے۔ سرداری کا دوسرا نام ہے قربانی۔

اب وہ لمحہ آیا جو خطروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہندوستان میں موسمِ سرما میں باز کے نام سے موسوم بھوندُ وجنوبی علاقوں میں آجاتے ہیں۔ وہ مردار خور نہیں ہوتے۔ عقاب اور شکرے کی طرح باز بھی وہی کچھ کھاتا ہے جسے اپنے پنجوں سے ہلاک کرتا ہے۔ یہ باز کمینے اور مکّار ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ گھٹیا قسم کے عقاب ہوتے ہیں لیکن ان کی شکل چیلوں کے مشابہہ ہوتی ہے اگر چہ ان کے پنکھوں کے سرے خم دار نہیں ہوتے۔ وہ جوڑی کی شکل میں، چیلوں کے جھنڈ سے کچھ زیادہ بلندی پر اڑتے ہیں جس سے وہ اپنے شکار کی نظر سے چھپے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ تو اپنے شکار کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن خود اس کو دکھائی نہیں دیتے۔

اُسی خاص دن جس دن رنگیلا نے ابھی ابھی سرداری کا اعزاز جیتا تھا میں نے دیکھا کہ بازوں کی ایک جوڑی چیلوں کی ایک ٹولی کے ساتھ اڑ رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنی انگلی منہ میں ڈال کر تیز سیٹی بجائی۔ رنگیلا نے میرا اشارہ سمجھ لیا اور اس نے اپنے پیروؤں کی رہنمائی کی اور خود مرکزی حصّے کی کمان سنبھال لی جبکہ اس نے جوہر اور ہیرا کو حکم دیا کہ وہ نصف دائرے کے دونوں سروں کو گھیرے رکھیں۔ جھنڈ نصف دائرے کی شکل میں اڑ رہا تھا۔ پورے کا پورا جھنڈ آپس میں یوں جڑا تھا جیسے ایک عظیم واحد پرندہ ہو۔ تب انہوں نے تیز رفتار سے نیچے کی طرف ڈبکی لگائی۔ جس کام کے لیے وہ آسمان میں ٹھہرے ہوئے تھے اب وہ کام مکمّل ہو چکا تھا۔ دوسری سبھی ٹولیاں جن کے ساتھ وہ صبح کو کھیلے تھے اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔

انہیں اتنی تیز رفتاری سے نیچے کی جانب غوطہ لگاتے دیکھ کر ایک باز ان کے سامنے یوں ٹپک پڑا جیسے ہمالیہ کی کسی چوٹی سے کوئی پتھر گرا ہو۔ جس سطح پر میرے پرندے اڑ رہے تھے وہاں تک اترتے ہی اُس نے اپنے پنکھ کھولے اور ان کے سامنے آگیا۔ یہ کوئی نیا حربہ نہیں تھا چونکہ ماضی میں بھی باز اِسے کبوتروں کی ٹولی میں دہشت پھیلانے کی غرض سے استعمال کرتے رہے

ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گیارہ میں سے دس بار تو یہ حربہ کامیاب رہتا ہے چونکہ جب یہ برتا جاتا ہے تو دہشت زدہ کبوتر سالمیت کا شعور کھو بیٹھتے ہیں اور تتّر بتّر ہو کر مختلف سمتوں میں اڑنے لگتے ہیں۔ بے شک اب باز کو یہی امید تھی لیکن ہمارا چالاک رنگیلا ذرا بھی ڈگمگائے بغیر اپنے پنکھوں سے جست لگاتا ہوا اپنے پورے جھنڈ کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے دشمن سے پانچ فٹ نیچے اڑنے لگا۔ ایسا اس نے یہ جانتے ہوئے کیا کہ باز کبھی کسی متحد جھنڈ پر نہیں جھپٹتا۔ لیکن ابھی وہ مشکل سے سوگز ہی آگے گیا تھا ایک دوسرا باز جو غالباً پہلے باز کی بیوی تھی، ان کبوتروں کے مقابل آگیا اور اپنے شوہر کی طرح اس نے بھی اپنے پنکھ کھول دیئے۔ لیکن رنگیلے نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے پورے جھنڈ کو سیدھا اُس مادہ باز کی سمت لے گیا۔ یہ بات کسی بھی سوچ سے باہر تھی۔ اس سے پہلے کسی بھی کبوتر نے اس طرح کی جرأت نہیں کی تھی چنانچہ مادہ باز کبوتروں کے حملے سے ڈر کر بھاگ گئی۔ جونہی اس نے اپنی پیٹھ موڑی رنگیلا اور اس کے مقلّدوں نے ڈبکی لگائی اور جتنی تیزی سے نیچے اتر سکتے تھے، لپک لئے۔ اب وہ ہماری چھت سے بمشکل چھ سوفٹ کی اونچائی پر تھے اور تب —— تقدیر کی شامت، مہلک بارود سے بھرے گولے کی طرح باز دوبارہ اُس نصف دائرے کے عین مرکز میں آن گرا اور غصّے میں چنگھاڑتے ہوئے اُس نے اپنے پنکھ اور چونچ آتش بار کانٹوں کی طرح کھول دیئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پورا جھنڈ جو ایک دیوار کی طرح سالم تھا، اب دو حصّوں میں کٹ گیا جس میں سے آدھا جھنڈ تو رنگیلا کے پیچھے ہو لیا اور دوسرا نصف حد درجہ خوف کے زیرِ اثر پتہ نہیں کس سمت میں بھاگ نکلا۔ رنگیلے نے اب وہی کیا جو ایک سچّے لیڈر کو اس طرح کے نازک وقت میں کرنا چاہئے۔ اُس نے اس خوف زدہ جھنڈ کا پیچھا کیا حتٰی کہ اس کی ٹکڑی نے دوسری ٹکڑی کو صحیح وقت پر جا لیا۔ اور لو وہ دوبارہ ایک دوسرے میں سما کر ایک مخلوط جھنڈ بن گئے۔ ابھی ایسا ہوا ہی تھا کہ باز کی بیوی بجلی کی طرح رنگیلا کے اور باقی کبوتروں کے درمیان نازل ہوگئی۔ اب اُس کی باری تھی۔ وہ بالکل اُس کی دُم پر ہی آگری اور اُسے باقی کبوتروں سے الگ کر دیا جنہوں نے اب اپنے سرپرست سے محروم ہو کر اُڑ نکلنے میں ہی اپنی سلامتی ڈھونڈی

اور دوسری ہر بات کا دھیان بھول گئے۔ اس سے رنگیلا بالکل اکیلا ہو گیا۔ اب اُسے ہر جانب سے حملے کے خطرے کا سامنا تھا۔ پھر بھی نڈر ہو کر اُس نے اپنے لوٹتے ہوئے ساتھیوں کی طرف نیچے کو اڑنے کی کوشش کی۔ اُس کے کوئی بارہ فٹ نیچے پہنچنے سے پہلے نر باز نیچے اڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اب جب رنگیلے نے دشمن کو اپنے اس قدر نزدیک پایا وہ زیادہ ڈھیٹ ہو گیا اور ایک قلابازی لگائی۔ یہ ایک سازگار قدم تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو باز کی بیوی جس نے اس کے پیچھے سے اپنے پنجے باہر پسار رکھے تھے، اسے تبھی دبوچ لیا ہوتا۔

اِس اثنا میں میرے باقی کبوتر تیزی سے لوٹ رہے تھے اور یوں سمجھئے کہ لگ بھگ گھر پہنچنے ہی والے تھے۔ وہ چھت پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی درخت سے پکے ہوئے پھل گرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک تھا جو بزدل نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ شجاعت بھرا ہوا تھا۔ یہ جوہر تھا سیاہ ہیرا۔ جب سارا جھنڈ ہماری چھت پر اطمینان سے بیٹھ گیا، اُس نے قلابازی لگائی اور اونچی اڑان بھری۔ اُس کے اِرادوں کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ رنگیلے کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔ رنگیلے کو دوبارہ قلابازی لگاتے دیکھ کر میاں باز نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اس نے رنگیلے کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور جوہر کے پیچھے پڑنے کے لیے نیچے کودا۔ آپ تو رنگیلے کے کرتب جانتے ہی ہیں۔ اُس نے جوہر کو بچانے کے لیے نیچے غوطہ لگایا اور بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی چال سے موڑ پر موڑ اور چکر پہ چکر کاٹنے لگا۔ باز کی بیوی اس کا پیچھا کرتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔ وہ اتنے موڑ نہیں کاٹ سکی جتنے رنگیلے نے کاٹے۔ لیکن میاں باز تو ٹھہرا تجربہ کار۔ وہ نشانہ سادھنے کے لیے اور اونچا چلا گیا تھا اور اس سے جوہر خطرے میں پڑ گیا۔ وہ ایک مزید موڑ غلط کاٹتا تو بس میاں باز اس کو جا لیتا۔ افسوس ان پرندوں کی عقل پر۔ جو کام اسے نہیں کرنا چاہیے تھا وہی اس نے کیا۔ وہ ایک سیدھی لکیر میں باز کے نیچے اڑنے لگا جس نے فوراً اپنے پنکھوں کی رفتار تیز کی اور خاموشی کی بجلی بن کر اس پر گرا۔ کوئی شور سنائی نہیں دیا، کسی آواز کا سایہ تک بھی نہیں۔ وہ مجسم موت کا پیکر نیچے، اور نیچے آتا گیا۔ تب سب سے خوفناک سانحہ واقع ہوا۔ باز اور جوہر کے درمیان پھسل کر آ گیا رنگیلا۔

کیسے آ گیا؟ کسی کو پتہ نہیں۔ وہ آیا جوہر کو بچانے کے لیے اور دشمن کے منصوبے کو ناکام کرنے کے لیے۔ افسوس کہ حملے سے باز آنے کے بجائے باز نے اپنے پنجے آگے نکالے وہ مداخلت کرنے والے رنگیلا کو قدرے ڈھیلی گرفت میں لے سکا۔ پروں کی بوچھاڑ ہوا میں بھر گئی۔ کچھ ایسا نظر آتا تھا کہ رنگیلے کا جسم دشمن کی مٹھی میں درد سے کلبلا رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے گرم لوہا میرے بدن کو چیر گیا ہو۔ میں اپنے پرندے کے لیے درد سے چلّا اٹھا لیکن بے سود۔ باز اسے اٹھائے ہوئے چکر کاٹتا ہوا اوپر ہی اوپر لے جا رہا تھا۔ وہ اپنے پنجوں کی گرفت اُس پر قدرے اور مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں میں اس سے بھی زیادہ ذلّت آمیز ایک بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرا دھیان رنگیلا کو بچانے کی طرف اس قدر مرکوز تھا کہ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ باز کی بیوی نے جھپٹ کر جوہر کو پکڑ لیا تھا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوا ہو گا۔ رنگیلا کے پکڑے جانے کے فوراً بعد ہی جوہر بھی دبوچا گیا۔ اب ہوا میں جوہر کے پر بکھر رہے تھے۔ دشمن نے اسے اپنے پنجوں میں کس کر پکڑ رکھا تھا اور وہ خود کو چھڑانے کے لیے کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ لیکن رنگیلا اس حالت میں نہیں تھا۔ وہ ابھی بھی میاں باز کی گرفت میں اینٹھ رہا تھا۔ باز کی بیوی اپنے شوہر کی مدد کے لیے اُس کے بہت قریب پہنچی تا کہ وہ اپنے شوہر کو اس کا شکار مضبوطی سے پکڑنے میں مدد کر سکے۔ عین اس وقت جوہر نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اس کے باعث وہ اپنے شوہر کے بہت نزدیک جھول گئی اور اس کے پنکھ اُس کے شوہر کے پنکھوں سے جا ٹکرائے۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ ہوا میں پلٹنے والا ہی تھا کہ رنگیلے نے خود کو اس کی مٹھی سے چھڑا لیا گو اس کے ساتھ ہی اُس کے کچھ اور پر ہوا میں بکھر گئے۔ اب وہ سیدھا نیچے کی طرف لپکا اور تیس سیکنڈ کے وقفے میں ہانپتا ہوا اور خون میں لت پت یہ پرندہ ہماری چھت پر آ پڑا تھا۔ میں نے اُس کے زخم کا جائزہ لینے کے لیے اُسے اوپر اٹھایا۔ اس کے دونوں پہلو پھٹے ہوئے تھے لیکن مہلک طور پر نہیں۔ میں اسے فوراً کبوتروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے اس کے زخموں پر مرہم پٹی کر دی۔ اس میں لگ بھگ آدھا گھنٹہ لگ گیا اور جب میں نے گھر واپس آ کر رنگیلے کو اُس کے ڈربے میں ڈالا تو مجھے جوہر کہیں نظر نہیں آیا۔ افسوس!

اس کا گھونسلا خالی پڑا تھا اور جب میں چھت پر پہنچا تو وہاں جوہر کی بیوی کو دیکھا جو منڈیر پر بیٹھی اپنے شوہر کی کھوج میں آسمان کے سبھی گوشے چھان رہی تھی۔ اُس نے نہ صرف وہ دن بلکہ مزید دو تین دن اِسی حالت میں گزارے۔ پتہ نہیں اُسے اس سچائی سے کچھ صبر و سکون ملا کہ اُس کے خاوند نے اپنے ایک بہادر ساتھی کی خاطر اپنی زندگی کی قربانی دے دی۔
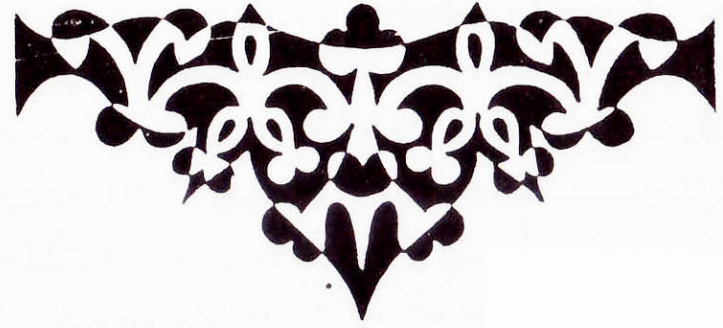
رنگیلے کی شادی

رنگیلے کے زخم بہت دھیرے دھیرے مندمل ہوئے۔ وسط فروری تک تو اسے چھت سے اوپر دس گز سے زیادہ فاصلے تک نہیں اڑایا جا سکتا تھا۔ اس کی اڑان کا وقفہ بھی بہت کم تھا چاہے میں اکثر چھت سے دور تک اکثر اس کا پیچھا کرتا تھا، میں چوتھائی گھنٹے سے زیادہ دیر تک اُسے ہوا میں نہیں رکھ پایا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ اُس کے پھیپھڑوں میں خرابی آ گئی ہے جب تشخیص کے بعد وہ تندرست ثابت ہوا تو پرواز کے لیے اُس کی عدم دلچسپی کا سبب میں نے اُس کے دل کی خرابی کو سمجھا جو شاید حالیہ حادثے میں زخمی ہو گیا ہو لیکن یہ مفروضہ بھی دوسری تشخیص کے بعد غلط ثابت ہوا۔

چنانچہ رنگیلے کے طرزِ عمل سے بے حد پریشان ہو کر میں نے گھونڈ کو ایک طویل خط لکھا اور جو کچھ واقعات ہوئے تھے ان کی پوری تفصیل اس خط میں لکھی لیکن ہوا یوں کہ وہ کسی انگریز کے ساتھ شکار پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے کوئی مدد حاصل نہ ہونے پر میں نے اپنے کبوتر کا بہت قریب سے جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہر روز میں اسے اپنے گھر کی چھت پر چھوڑتا اور بغور دیکھتا رہتا لیکن اس کے عارضے کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ لہٰذا میں نے رنگیلے کو پھر سے اڑتا دیکھنے کی امید چھوڑ دی۔

فروری کے آخر میں مجھے گھنے جنگل سے بھیجا ہوا گھونڈ کا ایک بہت مختصر خط ملا۔ لکھا تھا

''تمہارا کبوتر ڈرا ہوا ہے اُسے اُس کے خوف سے چھٹکارا دلاؤ اور اُسے اڑانے کی کوشش کرو۔''
لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سب کچھ کیسے کیا جائے۔ نہ ہی میں کوئی ایسی تدبیر سوچ سکا جس سے رنگیلے کو اونچے مقامات تک اڑنے کی ترغیب دی جا سکے۔ چھت سے باہر اس کا پیچھا کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میں اُس کو ایک کونے سے اڑاتا بھی تو وہ اڑ کر چھت کے پار دوسرے کونے تک جاتا اور وہاں بیٹھ جاتا۔ اور جو بات سب سے زیادہ پریشان کن تھی وہ یہ تھی کہ ہماری چھت پر بیٹھے ہوئے اُس پر کسی بادل کا یا اڑتے ہوئے پرندوں کے کسی جھنڈ کا سایہ پڑ جاتا تو وہ خوف کے مارے کانپنے لگتا۔ بلا شبہ جو بھی سایہ اُس پر پڑتا اُس کے ذہن میں یہ احساس بھر دیتا کہ کوئی باز یا عقاب اُس پر جھپٹنے کے لیے نیچے کود رہا ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ رنگیلا کس بری طرح ہمّت ہار چکا ہے۔ اُسے کس طرح اُس کے ڈر سے چھٹکارا دلایا جائے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ثابت ہوا۔ اگر ہم ہمالیہ میں ہوتے تو میں اُسے اُس مقدس لاما کے پاس لے جاتا جس نے پہلے ایک بار اُسے اِس مرض سے شفایاب کیا تھا لیکن یہاں ہمارے شہر میں کوئی لاما نہیں تھا لہٰذا مجبوراً مجھے انتظار کرنا پڑا۔

مارچ نے موسمِ بہار سے ملاقات کرادی تھی۔ اور رنگیلا جو غیر معمولی طور پر بال و پر نوچے جانے کے تجربے سے گزر چکا تھا کسی گہرے اور عظیم ساگر کے دل کی طرح نیلگوں لگ رہا تھا۔ وہ ناقابلِ بیاں حد تک حسین تھا۔ ایک دن، معلوم نہیں کیسے، میں نے اُسے جوہر کی بیوہ کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا۔ بسنت کی آمد کے ساتھ وہ بھی بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ دھوپ میں اُس کا ریشمی سیاہ پولکی پتھر جیسا رنگ یوں لگ رہا تھا جیسے گرم خطّے کی تاروں بھری رات۔ بے شک میں جانتا تھا کہ اُس کی رنگیلے کے ساتھ شادی اگرچہ دونوں کی اولاد کے لیے بہترین تو نہیں رہے گی لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ رنگیلے کو اُس کے خوف سے اُبھار دے اور اُس کبوتری کو اپنے ماتمی کیفیت سے نجات دلا دے جو جوہر کی موت کے دن سے اُس پر طاری تھی۔
اُن کی باہمی محبت کو بڑھاوا دینے کے لیے میں اُن دونوں کو ایک پنجرے میں ڈال کر

اپنے دوست رادجا کے ہاں لے گیا جو دو سو میل کے فاصلے پر ایک جنگل کے کنارے رہتا تھا۔ اُس کے گاؤں کا نام تھا گھاٹ سلا۔ یہ ایک دریا کے کنارے واقع تھا جس کے پار اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں جو گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور ہر طرح کے حیوانات سے بھری پڑی تھیں۔
رادجا چونکہ اپنے گاؤں کا پروہت تھا جس عہدے پر اُس کے پُرکھے دس صدیوں سے فائز رہتے آئے تھے اُس کے والدین کنکریٹ کی ایک بڑی عمارت میں رہائش پذیر تھے۔ گاؤں کا مندر بھی کنکریٹ سے بنا ہوا تھا اور ان کے گھر کے نزدیک تھا۔ اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے مندر کے آنگن میں ہر رات رادجا مندر میں جمع ہونے والے کسانوں کو شاستر پڑھ کر سنانے اور ان کی تشریح و وضاحت کے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ وہ جب مندر کے اندر اونچی آواز میں مقدس کتاب پڑھ رہا ہوتا تھا تو باہر دور تک تنگ ندی کے پار سے شیر کی گرج یا کسی جنگلی ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ یہ ایک خوبصورت اور خطرناک مقام تھا۔ گھاٹ سلا گاؤں میں تو کوئی خطرناک سانحہ نہیں ہوتا تھا لیکن آپ اگر کسی شکاری جانور کو دیکھنا چاہیں تو اُس کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو بہت دور نہیں جانا پڑتا تھا۔

جس ٹرین سے میں گھاٹ سلا آیا وہ رات کو وہاں پہنچی۔ رادجا اور اُس کے گھر کے تین نوکر اسٹیشن پر مجھے لینے آئے۔ ایک نوکر نے میری گٹھڑی اپنے کاندھوں پر اٹھا لی اور دوسرے نے دونوں کبوتروں والا پنجرہ اٹھا لیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو آندھی طوفان میں نہ بجھنے والی لالٹین اُٹھا کر چلنا تھا۔ ایک فاضل لالٹین وہ میرے لیے ساتھ لائے تھے۔ ایک واحد قطار میں جس میں ایک نوکر ہمارے آگے چل رہا تھا اور ایک پیچھے جب ہم ایک گھنٹہ بھر پیدل چل چکے تو میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور میں نے دریافت کیا:

''ہم لمبے راستے سے کیوں جا رہے ہیں؟''

رادجا بولا ''موسمِ بہار میں شمال کی جانب جاتے ہوئے جنگلی جانور یہاں سے گزرتے ہیں اس لیے ہم جنگل میں چھوٹا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔''

''کیا بکواس ہے۔اس سے پہلے میں کئی بار ایسا کر چکا ہوں۔اب ہم گھر کب پہنچیں گے؟''

''آدھا گھنٹے میں۔''

تب جیسے ہمارے قدموں میں ہی زمین پھٹتی ہوئی لگی جیسے کوئی آتش فشاں ایک بھیانک شور کے ساتھ پھٹ پڑا ہو اس طرح کی آواز آئی: ——ہوآ——ہو——ہو——ہو——ہوآ۔''

پنجرے میں کبوتر خوف کے مارے اپنے پنکھ پھڑ پھڑانے لگے۔ میں نے رادجا کے کندھے کو اپنے خالی ہاتھ سے پکڑ لیا لیکن میرے احساسات میں شریک ہونے کی بجائے وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسا اور مالک کی طرح دونوں نوکر بھی خوب ہنسے۔

جب ان کی ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو رادجا نے وضاحت کی۔''ہاں بھائی تم بہت بار ایسا کر چکے ہو نا؟ کیا کیا نہیں ایسا؟ تو پھر تم کو بندروں کی آواز نے کیوں خوف زدہ کر دیا، جو لالٹین کی روشنی دیکھ کر ڈر گئے تھے۔''

''کیا——؟ بندر؟''

''ہاں بہت سارے'' میرے دوست نے یاد دلایا ''اگر سال کے اِس حصے میں شمال کی جانب چلو تو—— ہمارے سر کے اوپر درختوں پر جو بندروں کا پورا غول ہے وہ ڈر گیا ہے۔بس اتنی سی بات ہے۔آئندہ ہر بندر کی چلاّہٹ کو شیر کی دہاڑ مت سمجھ بیٹھنا۔''

خوش قسمتی سے ہم جلدی ہی گھر پہنچ گئے اور راستے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو میرے سکون کو برہم کرتا۔

اگلی صبح رادجا اپنے بزرگوں کے مندر میں اپنے فرائض ادا کرنے چلا گیا جبکہ میں نے چھت پر لے جا کر اپنے پرندوں کو پنجرے سے آزاد کر دیا۔ پہلے پہل تو وہ گھبرا گئے۔لیکن مجھے میرے ہاتھوں میں مکھن سنے دانے بھرے ہوئے اپنے قریب دیکھ کر وہ بغیر کسی بکھیڑے کے ناشتہ

کرنے بیٹھ گئے۔تقریباً پورا دن ہم نے چھت پر ہی گزارا۔میں نے انہیں چھت پر زیادہ دیر کے لیے رہنے دینے کا خطرہ مول نہیں لیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ غیر مانوس گرد و پیش سے پریشان ہو جائیں۔

اگلے ہفتے کے دوران یہ دونوں پرندے گھاٹ سلا سے مانوس ہو گئے۔اس کے علاوہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی ان کا بہت میل جول ہو گیا۔اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے ان کو باقی کے جھنڈ سے الگ تھلگ کر کے دانش مندی کا کام کیا تھا۔ ہمارے وہاں قیام کے آٹھویں روز رادجا اور میں یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ رنگیلا اڑتا ہوا اپنے ساتھی کا پیچھا کر رہا ہے۔وہ اڑتی رہی لیکن کم بلندی پر، اور رنگیلا اس کا تعاقب کرتا رہا۔اُسے اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ اور اوپر اٹھ گئی اور پھر واپس مڑی۔رنگیلے نے بھی وہی کیا اور اُس کے پیچھے پیچھے اُڑا۔وہ پھر اور اوپر اڑنے لگی لیکن اس مرتبہ وہ رُک گیا اور اُس کے نیچے نیچے ہوا میں چکّر کاٹتا رہا۔تاہم میں نے محسوس کیا کہ اب اُس کی خود اعتمادی بحال ہو رہی ہے۔آخر کار رنگیلا جو کبوتروں میں بے نظیر آدرش تھا اپنے خوف سے اور آسمان کی ہیبت سے شفایاب ہو رہا تھا اور ایک بار پھر آکاش سے مانوس ہو رہا تھا۔

اگلی صبح یہ پرندے اور اونچا اڑے اور ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے رہے۔رنگیلے نے پھر پورا فاصلہ طے کرنے سے انکار کر دیا اور کبوتری کے نیچے نیچے ہوا میں چکّر کاٹنے کی بجائے تیزی سے نیچے لوٹنے لگا۔میں اُسے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن رادجا نے جو ذہین آدمی تھا، اُس کی تشریح کرتے ہوئے کہا، ''ایک پنکھے جتنا بڑا بادل سورج کے سامنے آگیا ہے۔اس کا سایہ اتنا اچانک پڑا کہ رنگیلا نے سوچا کہ دشمن آگیا ہے۔بادل کے گزر جانے تک انتظار کرو، پھر دیکھنا۔''

رادجا کا کہنا بالکل صحیح تھا۔کچھ ہی سیکنڈوں میں سورج نکل آیا اور ایک بار پھر رنگیلے کے پنکھوں سے سورج کی روشنی ٹپکنے لگی۔فوراً اس نے نیچے اترنا چھوڑ کر ہوا میں چکّر لگانا شروع کر دیا۔ اُس کی دوست بھی جو اُسے رفاقت دینے کے لیے نیچے کو آ رہی تھی اس سے کوئی ایک سوفٹ اوپر اڑتی ہوئی اُس کا انتظار کرنے لگی۔اب رنگیلا اس طرح اوپر کو اٹھا اور اپنے پنکھوں سے یوں جست

لگانے لگا جیسے کوئی عقاب ابھی پنجرے سے چھوٹا ہو۔ جب وہ پنکھ جھلاتا ہوا اور موڑ کاٹتا ہوا اوپر کو جا رہا تھا تو اُس کے اِرد گرد سورج کی روشنی رنگ کے گنڈ انڈیل رہی تھی۔ جلد ہی بجائے اپنی محبوبہ کے پیچھے اڑنے کے وہ آگے تھا اور وہ اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اِس طرح وہ آسمان پر چڑھ گئے۔ اِدھر یہ اپنے خوف سے چھٹکارا پا چکا تھا تو اُدھر وہ اُس کی پھرتی اور طاقت پر موہت ہو چکی تھی۔

اگلی صبح دونوں نے جلد ہی اڑان بھر لی۔ وہ بہت دور تک اور بڑی دیر تک اُڑتے رہے۔ کچھ دیر تک تو وہ پہاڑوں کے اُس پار کھو گئے جیسے کہ وہ چوٹیوں سے پھسل کر پربت کے پرے پار نیچے اتر گئے ہوں۔ وہ گھنٹہ بھر تو اُدھر ہی رہے۔

آخر تقریباً گیارہ بجے وہ لوٹ آئے۔ دونوں کی چونچوں میں ایک ایک لمبا تنکا تھا۔ اب وہ انڈے دینے کے لیے گھونسلا بنانے چلے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں انہیں اب گھر لے جاؤں۔ لیکن راد جا نے اصرار کیا کہ ہم کم از کم ایک ہفتہ اور ٹھہریں۔

اس اگلے ہفتے کے دوران ہم کچھ گھنٹے دریا کے پار زیادہ خطرناک جنگل میں گزارتے رہے۔ ہم اپنے کبوتروں کو ہمراہ لے جاتے تھے تاکہ گھنے جنگل میں جو راد جا کے گھر سے مشکل سے پانچ میل دور تھا، انہیں آزاد کریں۔ رنگیلا اب اپنی جہت سادھنے کی صلاحیت کی آزمائش کرنے اور مزید اونچی اڑان بھرنے کے اور سب کچھ بھول چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اپنی محبوبہ کی محبت، نیز مقام اور آب و ہوا کی تبدیلی نے اُسے اپنے خوف سے شفا دلا دی تھی جو اُس کی بیماری کا بڑا سبب تھا۔

یہ بات اب بالکل ذہن میں نقش ہو جانی چاہئے کہ ہماری سبھی تکلیفوں کی جڑ ہے——
ڈر، تشویش اور نفرت۔ ان میں سے ایک بھی اگر کسی شخص کو لگ جائے تو باقی دونوں بھی اپنے آپ شامل ہو جاتی ہیں۔ کوئی بھی شکاری جانور اپنے شکار کو پہلے خوف زدہ کئے بغیر نہیں مار سکتا۔ اصل میں کوئی بھی جانور ہلاک نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے جان سے مار ڈالنے والا اُس کے دل میں ڈر نہ ڈال دے۔ مختصر الفاظ میں دشمن کی حتمی چوٹ سے پہلے کسی جانور کا اپنا ڈر ہی اُسے مار ڈالتا ہے۔

رنگیلے کو جنگ سے بلاوا

اگست کے پہلے ہفتے میں بچوں کے جنم کے جلد بعد ہی، ہیرا اور رنگیلا گھونڈ کے ہمراہ بمبئی چلے گئے۔ انہیں عالمی جنگِ عظیم میں خدمات سرانجام دینے کے لیے بذریعہ بحری جہاز روانہ ہونا تھا۔ میں نے رنگیلا کے ساتھ اُس کنوارے پرندے ہیرا کو بھی بھیج دیا چونکہ افواج کو ان دونوں کی ضرورت تھی۔

مجھے خوشی تھی کہ فلینڈرس اور فرانس کے درمیان میدانِ جنگ کے لیے سمندری راستے سے روانہ ہونے سے پہلے رنگیلے کو اپنے ننھے بچوں کے بارے میں کچھ علم ہو چکا تھا۔ اس خوشی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مجھے معلوم تھا جس کبوتر کی بیوی اور نوزائیدہ بچے گھر میں انتظار کر رہے ہوں، شاذ و نادر ہی واپس آنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ رنگیلا اور اُس کے خاندان میں باہمی محبت کا وہ بندھن میرے اِس یقین کا باعث تھا کہ وہ پیغام رسانی کا کام بڑی خوبی سے کرے گا۔ جب تک وہ زندہ ہے نہ کوئی بندوق کا دھماکہ اور نہ کوئی گولی اُسے بالآخر گھر واپسی سے روک پائے گی۔

لیکن یہاں کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ گھر تو اس کا کلکتہ میں تھا اور جنگ ہزاروں میل دور تھی۔ یہ سچ ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو گھر پر چھوڑ گیا تھا، وہ گھونڈ کے ہمراہ اپنے عارضی آشیانے میں واپس اُڑ آنے کا پورا جتن کرے گا۔

کہا جاتا ہے کہ رنگیلے نے بہت سارے اہم پیغامات جنگ کے مورچہ اور مرکزی فوجی دفتر کے درمیان باہم پہنچانے کا کام کیا۔ اور دفتر میں اعلیٰ کمانڈر اور گھونٹ اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔ بے شک گھونٹ کے ساتھ رنگیلا پہلے سے مانوس تھا لیکن بعد کے مہینوں میں وہ اعلیٰ کمانڈر کا بھی گرویدہ بن گیا۔

دونوں کبوتروں کے ساتھ گھونٹ ہی گیا تھا۔ میں اس لیے نہیں گیا چونکہ میں ابھی نابالغ تھا۔ عمر کم ہونے کے باعث میں کسی ملازمت کے لیے لائقِ تقرّر نہیں تھا۔ اس لیے اُس بزرگ کو ان کبوتروں کی رفاقت کرنی پڑی۔ بھارت سے مارسیلز کے بحری سفر کے دوران ہیرا اور رنگیلا اور وہ عمر رسیدہ شکاری آپس میں گہرے دوست بن گئے۔ میں نے ابھی تک ایسا کوئی غیر مانوس جانور نہیں دیکھا جس نے زیادہ دیر تک گھونٹ کی دوستی کی مزاحمت کی ہو۔ چونکہ میرے کبوتر اس سے پہلے سے واقف تھے۔ ان کے لیے اس کی دوستی قبول کرنا آسان تھا۔

ستمبر 1914 سے آگے آنے والے موسمِ بہار تک بھارتی فوج کے فلینڈرس قیام کے دوران گھونٹ اپنا پنجرہ لیے ہوئے صدر فوجی دفتر کے قریب مقیم رہا۔ جبکہ ہیرا اور رنگیلا کو فوج کی مختلف پلٹنیں (ٹکڑیاں) مورچے پر لے جاتی تھیں۔ وہاں مختلف موقعوں پر باریک کاغذ پر سندیش لکھے جاتے تھے۔ ان کاغذوں کا وزن ایک اونس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا اور یہ کاغذات کبوتر کے پاؤں کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے اور تب اُسے ہوا میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ رنگیلا پیغام لے کر یقینی طور پر مرکزی دفتر میں گھونٹ کے پاس پہنچتا تھا۔ وہاں اُس پیغام کو پڑھ کر اُس کا مفہوم سمجھا جاتا تھا اور خود اعلیٰ کمانڈر اُس کا جواب لکھتا تھا۔ ایسی افواہ ہے کہ خود کمانڈر-ان-چیف رنگیلے کا بڑا گرویدہ تھا اور اُس کی خدمات کی بہت قدر کرتا تھا۔

لیکن بہتر ہوگا کہ ہم رنگیلے کی کہانی اُسی سے سنیں۔ جس طرح خواب میں دیکھے ہوئے واقعات خود خواب دیکھنے والے کے علاوہ کوئی دوسرا بیان نہیں کر سکتا، اِسی لیے رنگیلا کے کچھ پُر خطر معرکے خود رنگیلے ہی کو نجی طور پر سُنانے دیجئے۔

''جب ہم کالے پانی —— یعنی بحرِ ہند اور بحیرۂ روم کو عبور کر چکے، ہم نے بذریعہ ریل ایک اجنبی ملک کے بیچ سفر کیا۔ اگر چہ ستمبر کا مہینہ تھا پھر بھی اُس ملک —— فرانس —— میں اتنی ہی سردی جتنی جنوبی ہندوستان میں ان دنوں میں ہوتی ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں برف سے ڈھکے پربت اور دیو قامت درخت دیکھوں گا چونکہ میرے خیال میں میں ہمالیہ کے قریب جا رہا تھا۔ لیکن اُفق تک مجھے کوئی ایسا درخت نہیں دکھائی دیا جو ہمارے لمبے سے لمبے بانس کے پیڑ سے زیادہ اونچا ہو۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ جب کوئی ملک زیادہ اونچائی پر واقع نہ ہو تو پھر بھی وہ اتنا کیوں سرد ہے۔

آخر کار ہم جنگ کے محاذ پر پہنچ گئے۔ یہ محاذِ جنگ کا عقبی سرا تھا، پھر بھی اُس جگہ بھی آگ اُگلنے والی توپوں کی گونج —— بوم —— بوم —— بوم سنائی دیتی تھی۔ ایک معمولی کبوتر ہوتے ہوئے میں بھی آگ اُگلنے والے ہتھیاروں سے نفرت کرتا ہوں چاہے وہ کسی سائز اور شکل کے ہوں۔ دھات کے بنے ہوئے وہ کُتّے جو بھونکتے ہیں اور موت اُگلتے ہیں مجھے پسند نہیں۔ میرے دو روز وہاں رہنے کے بعد ہماری آزمائشی اڑان شروع ہوئی۔ ہیرا کے اور میرے علاوہ ہمارے شہر کے صرف چار کبوتر اور تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہیرا کس قدر جلد باز ہو سکتا تھا جونہی ہم ایک بڑے گاؤں کے اوپر سے اڑے ہیرا بوم —— بوم —— بوم کی (جنگی توپوں کے چلنے کی جگہ) سمت اُڑ چلا۔ وہ تحقیقات کرنا چاہتا تھا۔ آہ! کتنا شور تھا وہاں۔ دھات کے بنے ہوئے کتے جو درختوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے کڑکتی بجلی کی طرح آگ کے گولے اُگل رہے تھے جو پھنکارتے ہوئے ہمارے نیچے دھماکے کی طرح پھٹ رہے تھے۔ میں ڈر گیا اور اُڑتا اُڑتا اوپر نکل گیا لیکن آسمان کی دور ترین بلندی میں بھی مجھے سکون نہیں ملا۔ پتہ نہیں کہاں سے لمبے چوڑے عقاب گرجتے اور غراتے ہوئے یوں نمودار ہوئے جیسے چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی۔ ہم ایسا ہولناک منظر دیکھ کر اُس مقام کی جانب اڑ چلے جہاں گھونٹ ہمارا انتظار کر رہا تھا لیکن ان عقابوں میں سے دو نے ہمارا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ہم تیز اور تیز اڑے۔ خوش قسمتی سے وہ ہم تک نہیں پہنچ پائے۔
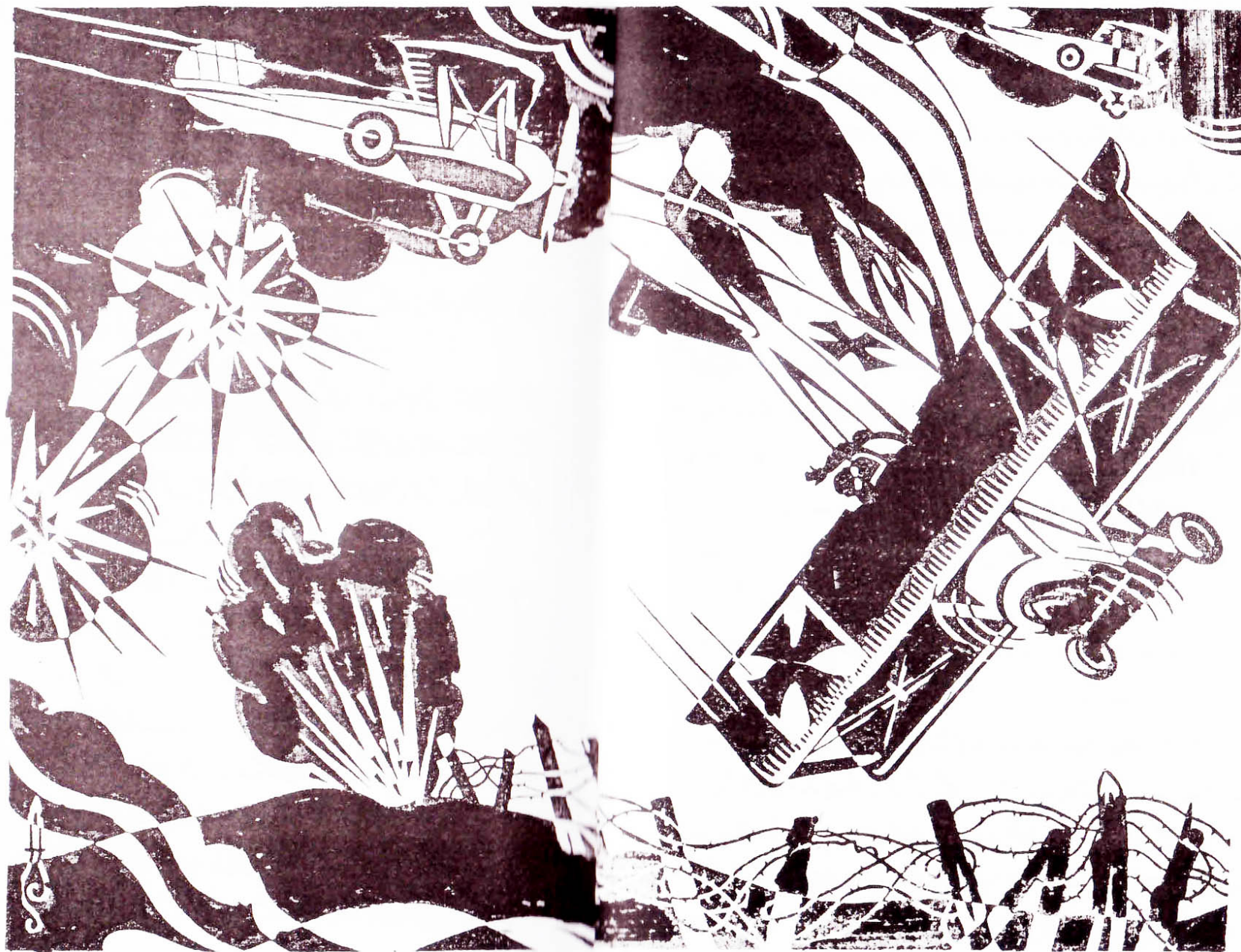
جیسا کہ ہمیں امید تھی وہ عقاب وہیں آن اترے جہاں ہم رہتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب موت قریب ہے۔ وہ عقاب ہمارے پنجروں میں ہمیں نیولے کی طرح نگلنے کو تھے لیکن نہیں۔ جلد ہی انہوں نے گرجنا بند کر دیا اور وہ میدان میں مُردہ پڑے دکھائی دیئے۔ ان دو عقابوں (ہوائی جہازوں) کے پیٹ میں سے دو آدمی برآمد ہوئے اور چلنے لگے۔ ہم حیران تھے کہ عقاب انسانوں کو کیسے ہڑپ کر سکتے تھے اور پھر یہ کیسے زندہ باہر آسکتے تھے۔

جلد ہی وہ آدمی اپنے مشن سے واپس آگئے اور چڑھ کر عقابوں (جہازوں) کے اندر چلے گئے اور تب ایک غرّاہٹ اور گرج کے ساتھ وہ عقاب زندہ ہوگئے اور دوبارہ ہوا میں اڑ گئے۔ اس سے میرے دل نے کہا بلا شبہ یہ انسانوں کے رتھ ہیں۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوگیا تو میری جان میں جان آئی۔

اگرچہ پہلے پہل ہر چیز عجیب سی لگتی تھی لیکن آہستہ آہستہ جب ہم اس کے عادی ہوگئے تو یہ کیفت نہ رہی پھر بھی گرجنے اور غرانے کی مسلسل آوازوں کے بیچ گہری نیند سونے کا مسئلہ حل طلب ہی رہا۔ میں جتنے مہینے فوج میں رہا اچھی طرح نیند نہیں لے سکا۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ ہیرا اور میں گھبرائے ہوئے اور بے چین رہے بالکل نوزائیدہ سانپوں کی طرح۔

میرا پہلا پُرخطر معرکہ تھا محاذِ جنگ سے ایک رسالدار کا پیغام لے جانا۔ محاذِ جنگ جہاں ہر قسم کے دھات کے کتے دِن رات بھونکتے اور آگ اُگلتے رہتے تھے۔ ضروری ہے کہ میں آپ کو اس رسالدار کے بارے میں ذرا سا بتا دوں۔ وہ کلکتہ سے تعلق رکھنے والے بہت سارے ہندوستانی سپاہیوں کا سردار تھا۔ وہ مجھے کالے ٹاٹ سے پوری طرڈھکے ہوئے پنجرے میں اٹھائے ہوئے اپنے چالیس سپاہیوں کے ساتھ محاذِ جنگ کی ایک خندق کی جانب روانہ ہوا۔ ہم کئی گھنٹوں اور راتوں کے پیدل سفر کے بعد، اندھیرے پنجرے میں تو ایسا ہی لگتا تھا، ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ وہاں جا کر ٹاٹ اتار دیا گیا۔ وہاں مجھے اپنے چاروں طرف کچھ بھی دکھائی نہیں دیا سوائے دیواروں کے جن کے بیچ ہندوستان سے آئے ہوئے پگڑیوں والے آدمی چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی طر رینگ

رہے تھے۔ ہمارے سروں کے اوپر مشینی عقاب گرجتے ہوئے دہشت پھیلا رہے تھے۔ یہاں آکر مجھے پہلی مرتبہ آوازیں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ ایک طرح کی گڈ مڈ بُوم، بُوم، بُوم کی جگہ اب مختلف درجوں کے دھماکے سُنائی دیتے تھے اور کان ان کی الگ الگ پہچان کر سکتے تھے۔ جس آواز کو سمجھنا سب سے دشوار تھا وہ تھی اُن لوگوں کی خود میرے بارے میں گفتگو۔ دھماکوں کی بہرہ کر دینے والی آوازوں کے بیچ آدمیوں کی بات چیت گھاس کی سرسراہٹ جیسی لگتی تھی۔ گاہے بگاہے وہ ایک دھات کے کتّے کے منہ پر سے جالی اتارتے تھے اور وہ بھونکتا تو ایک لمبے وقفے تک آگ اُگلتا رہتا تھا۔ تب ایک چرخ (لکڑ بگھے) کی ہنسی جیسی آواز آتی تھی۔ سینکڑوں آدمی ان چھوٹے چھوٹے کتوں کو آنکس مارتے جس سے وہ پک پف، پک پف، پک پف کی آواز کرتے ہوئے کھانستے تھے۔ اُن کی آواز گہری کرخت آواز والے عقابوں (ہوائی جہازوں) کی چنگھاڑ میں گُم ہو جاتی تھی، جو جھنڈ کے جھنڈ اوپر اڑتے ہوئے بھونکتے اور پاگلوں کی طرح چیختے تھے اور ایک دوسرے کو چڑیوں کی طرح قتل کرتے تھے۔ جو رسالدار میرا انچارج تھا اُس نے اپنے کُتے کا رخ آسمان کی طرف کیا اور پک پف کی آواز کے ساتھ اُس میں سے کچھ آگ چھوڑ دی اور یہ لو! اُس نے اُن عقابوں میں سے ایک کو نیچے گرا دیا جیسے وہ کوئی خرگوش ہو۔ اب ایک سب سے بلند آواز سنائی دی بُوم، بُزوم-بز-بم! یہ تھی عظیم دیوہیکل پُر ہیبت کتوں (توپوں) کی شیر جیسی دہاڑ اور یہ خدائی سُروں کے ایک شامیانے کی طرح پھیل گئی۔ اس کی ہمہ گیر وسعت تلے دوسری سب ہلکی آوازیں دب کر رہ گئیں۔ اُف توپوں کے منہ سے نکلی ہوئی اُس اذیت ناک آواز کا شراپ! کیا میں اُسے کبھی بھول پاؤں گا؟ دہاڑ پر دہاڑ، اور پھر دہاڑ۔ وہ زبردست فوق البشر آہنگ در آہنگ جیسے کسی بھیانک سیلاب میں آوازوں کے پتھر ٹوٹ کر باہم ٹکرا رہے ہوں۔

خوبصورتی موت کے اس قدر قریب کیوں رہتی ہے۔ ہمارے سروں کے اوپر برپا اُس آسمانی موسیقی کے ناقابلِ بیان جلال نے ابھی میری روح کو اپنی گرفت میں لیا ہی تھا کہ ہمارے اردگرد آگ کے گولے موسلا دھار مینہ کی طر برسنے لگے۔ سپاہی یوں گرنے اور ہلاک ہونے لگے

جیسے سیلاب بلوں میں چوہے۔ رسالدار نے اس کا جسم بہتے ہوئے خون سے سُرخ ہو گیا تھا، جلدی جلدی ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھا اور وہ کاغذ میرے پاؤں سے باندھ دیا اور پھر مجھے پنجرے سے چھوڑ دیا۔ اُس کی نگاہوں کی کیفیت سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ سخت مصیبت میں ہے اور وہ چاہتا ہے کہ گھونڈ اسے کمک بھجوائے۔

میرے سوامی بے شک آپ جانتے ہیں کہ میں اُڑا لیکن جو کچھ میں نے اُس وقت دیکھا اُس سے میرے پنکھ جیسے جم سے گئے۔ ان خندقوں کے اوپر کی ہوا اڑتی ہوئی آگ کی ایک واحد چادر بن چکی تھی۔ اب میرا مسئلہ تھا اس سے اوپر اٹھ کر اُڑنا۔ میں نے اپنی دم کا چپّو استعمال کیا اور ہر سمت اڑان بھرنے کی کوشش کر دیکھی لیکن میں جس راستے سے بھی گیا میرے اوپر شعلوں کی لاکھوں کروڑوں ڈھرکیاں مجھ سے اوپر اڑتی دکھائی دیں جو زندگی کی کھڈّی پر سرخ تباہی کا جامہ بُن رہی تھیں۔ لیکن مجھے اڑنا ہی تھا۔ مجھے —— اپنے باپ کے بیٹے رنگیلے کو اڑنا ہی تھا اور جلد ہی میں ہوا کے ایک ایسے منطقے سے ٹکرایا جو ایسی رو سے بھرا ہوا تھا، جو کہ مجھے اپنی طرف کھینچ کر گھماتی ہوئی اوپر کو لے گئی جیسے کہ میرے پنکھ ٹوٹے ہوئے ہوں اور میں ایک پتے کی طرح ہلکی چیز ہوں۔ یہ ہوائی رو مجھے اوپر، پھر نیچے، پھر اوپر اس طرح اچھالتی رہی یہاں تک کہ میں نے آگ کے اس کپڑے میں سے اپنا راستہ نکال لیا، جو کہ مسلسل تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ بُنا جا رہا تھا۔ لیکن اب میری نگاہ میں صرف ایک نشانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ گھونڈ کے پاس —— گھونڈ کے پاس۔ بس یہی میں خود سے کہتا رہا۔ اور جب جب میں خود کو یہ کہتا، یہ میری روح کو ایک تازہ مہمیز لگاتا اور مجھے بہترین اور زبردست کوشش کرنے کے لیے جوش دلاتا۔ اب جب میں اڑ کر بہت اونچائی پر پہنچ چکا تو میں نے مشاہدہ کیا اور مغرب کی جانب اپنا رُخ موڑ لیا۔ عین اُسی وقت ایک گولی میرے چپو (دُم) کو چیر گئی اور اُسے توڑ دیا۔ میرے دُم کا آدھا حصہ جل گیا اور میرے بدن سے الگ ہو گیا۔ آپ جانیں، اس نے مجھے طیش دلا دیا۔ میری دُم تو میرے وقار کی علامت ہے۔ مجھ پر گولی چلانا تو درکنار، میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے جسم کو چھوئے بھی۔ خیر میں

اڑ کر سلامتی سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ لیکن بالکل اُسی دم جب میں نیچے اترنے کی تیاری کر رہا تھا، دو عقابوں (ہوائی جہازوں) نے مجھ سے اوپر آسمان میں لڑائی شروع کر دی۔ میں نے ان کی دہاڑ سنی تھی نہ ان کے چہرے دیکھے تھے۔ اگر انہوں نے ایک دوسرے کو مار گرایا ہوتا تو میں پرواہ نہ کرتا لیکن انہوں نے تو شعلوں کا ایک طوفان میرے پیچھے چھوڑ دیا۔ جتنا زیادہ وہ آپس میں لڑتے تھے اتنی زیادہ آگ ان کی چونچوں سے گرتی تھی جتنی تیزی سے مجھ سے ہو سکا میں نے نیچے کو غوطے لگائے۔ کاش وہاں انہوں نے کچھ پیڑ اگائے ہوتے۔ بے شک وہاں درخت تو تھے لیکن ان میں سے اکثر کو گولے لگے تھے اور وہ کٹے پھٹے تھے اسی لیے وہ رُنڈ مُنڈ کھونٹوں جیسے کھڑے تھے۔ ان میں نہ کوئی سایہ بخش نفیس پتے تھے اور نہ گھنی ٹہنی۔ چنانچہ مجھے ٹیڑھا میڑھا اُڑ کر اُن خستہ حال نوکیلے ڈنڈوں کے آگے پیچھے سے راستہ طے کرنا پڑا جیسے کوئی آدمی جنگل میں ہاتھیوں سے جان بچا کر بھاگ رہا ہو۔ آخر کار میں گھر پہنچ گیا اور گھونڈ کی کلائی پر جا بیٹھا۔ اُس نے تاگا کاٹا اور پیغام کو اور مجھے اعلیٰ کمانڈر کے پاس لے گیا جو ایک پکے ہوئے شاہ دانہ کی طرح لگتا تھا اور جس سے صابن کی دلکش مہک آ رہی تھی۔ دوسرے سپاہیوں کے برعکس وہ غالباً دن میں تین چار بار صابنوں سے نہا دھو کر خود کو صاف رکھتا ہو گا۔ رسالدار نے کاغذ پر جو کچھ گھسیٹا تھا اُسے پڑھ لینے کے بعد کمانڈر نے میرے سر پر تھپکی دی اور ایک خوشدل بیل کی طرح ہُنکاری بھری۔''

دوسری مہم

''اگلی مرتبہ ہمیں تب محاذِ جنگ پر لے جایا گیا جب رسالدار کے معمولی زخم مندمل ہو چکے تھے۔ اس موقعہ پر وہ ہیرا کو اور مجھے دونوں کو لے گیا۔ ہمیں فوراً پتہ چل گیا کہ جو پیغام ہمیں لے جانا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ ہم دونوں کے سپرد کیا جانا ہے تاکہ کم سے کم ایک تو اسے پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔

کڑاکے کی سردی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں برف کی سلطنت میں رہ رہا ہوں۔ ہر وقت بارش ہوتی رہتی تھی۔ زمین ایسی تھی کہ ہر بار جب اس پر قدم رکھوں تو پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے تھے اس قدر سردی لگتی تھی جیسے کسی لاش پر قدم رکھ دیئے ہوں۔

اب ہم ایک عجیب جگہ پر پہنچے۔ یہ کوئی خندق نہ تھی بلکہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کے اِردگرد جاں سوز تباہی کا جوار بھاٹا ٹکرا ٹکرا کر دھماکے کر رہا تھا۔ وہاں کے لوگوں کے چہروں سے اظہار ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت متبرک اور اہم مقام ہے چونکہ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے حالانکہ موت کی سرخ زبانیں وہاں کی تقریباً ہر چھت، ہر دیوار اور ہر درخت تک کو چاٹ رہی تھیں۔ میں اُس کھلی جگہ پر آ کر بہت خوش تھا۔ وہاں سے آسمان کو نیچے، بہت نیچے جھکا ہوا دیکھا جا سکتا تھا۔ زمین کے بعض ایسے ٹکڑے جو پالا پڑنے سے سفید ہو چکے تھے، دیکھے جا سکتے تھے، جہاں ابھی تک

کوئی گولہ نہیں گرا تھا۔ اُس مقام پر گولی باری اور بمباری کا عین مرکز تھا اور جہاں اسی وجہ سے مکان یوں گرتے تھے جیسے موسلا دھار بارش میں پرندوں کے گھونسلے گرتے ہیں، اس کے باوجود وہاں ایک بل سے دوسرے بل میں دوڑتے پھرتے تھے، بڑے بڑے چوہے پنیر چراتے تھے اور مکڑیاں مکھی پکڑنے کے لیے جالے بنتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے کام کاج میں بدستور یوں مصروف تھے جیسے کہ انسانوں کا قتلِ عام اور وہ بھی اپنے بھائی انسانوں کے ہاتھوں اس طرح معمولی اور نظر انداز کرنے کے قابل ہو جیسے کہ آسمان میں چھائے ہوئے بادل۔

کچھ دیر بعد گولہ باری کی آواز بند ہو گئی اور ایسا لگنے لگا جیسے کہ وہ گاؤں جتنا کچھ بچا ہوا تھا، اب حملے سے محفوظ ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ آسمان اس قدر نیچے جھکا ہوا لگتا تھا کہ میں اپنی چونچ اس میں ڈال سکتا تھا۔ سردی نے میرے ایک ایک پر کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور اُسے نوچ رہی تھی۔ میرے لیے سکون سے پنجرے میں بیٹھنا قطعاً ناممکن ہو گیا۔ ہیرا اور میں خود کو گرم رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

گولیاں چلنی پھر شروع ہو گئیں اور اس بار ہر طرف سے۔ ہمارا یہ چھوٹا سا گاؤں ایک جزیرہ نما تھا جسے چاروں طرف سے دشمن نے گھیر رکھا تھا۔ ظاہر تھا کہ دُھند کی آڑ میں جس نے کہ سب چیزوں کو لپیٹ رکھا تھا، دشمن نے عقب سے ہمارے مواصلات کاٹ دیئے تھے۔ تب انہوں نے فضائی راکٹ داغنے شروع کر دیئے۔ ہمالیائی خطے کی رات کی طرح اندھیرا اور چپچپاہٹ چھائی تھی حالانکہ مشکل سے ابھی دوپہر کا وقت تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ لوگوں کو کیسے پتہ چلتا ہو گا کہ یہ رات نہیں بلکہ دن ہے۔ آخر کار انسان تو پنچھیوں سے کم علم رکھتے ہیں۔

ہیرا کو اور مجھے اپنے اپنے پیغام لے جانے کے لیے آزاد کر دیا گیا۔ ہم اوپر اڑے لیکن زیادہ دور نہیں جا پائے تھے کہ ہمیں تھوڑی ہی دیر میں دھند نے نگل لیا۔ ہمیں آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک نم دار ٹھنڈا جالا ہماری آنکھوں پر چھا گیا۔ لیکن مجھے پہلے ہی سے ایسی رکاوٹ کی توقع تھی۔ میں نے وہی کیا جو اِن حالات میں مجھے کرنا چاہیئے تھا خواہ محاذِ جنگ پر خواہ ہندوستان

میں۔ میں نے اوپر کی جانب رخ کیا لیکن ایسا لگا کہ میں ایک بار ایک فٹ سے زیادہ آگے نہیں جا سکوں گا۔ میرے پنکھ بھیگ چکے تھے۔ میرے سانس لینے میں بھی لمبے وقفے کی چھینکیں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں لمحہ بھر میں مُردہ ہو کر گر پڑوں گا۔ کبوتروں کے دیوتاؤں کا شکریہ اب مجھے کچھ گز آگے تک دکھائی دینے لگا تھا۔ چنانچہ میں اور اوپر اڑنے لگا۔ اب میری آنکھیں درد کرنے لگیں۔ اچانک مجھے سوجھا کہ میں اپنی آنکھوں کی جھلّی نیچے کھینچ لوں، جو میری آنکھوں کی دوسری پُتلی ہے جسے میں آندھی کے دوران اڑتے وقت استعمال کرتا ہوں تاکہ میں اندھے پن سے بچ سکوں۔ چونکہ ہم اب دُھند میں گھرے ہوئے نہیں تھے بلکہ یہ ایک بدبودار اور آنکھوں کے لیے تباہ کُن دھواں تھا جو انسانوں نے چھوڑا تھا، میری آنکھوں میں درد ہو گیا جیسے کہ ان میں کسی نے سوئیاں چبھو دی ہوں۔ اب میری جھلّی نے میری آنکھوں کو ڈھک کر محفوظ کر دیا تھا۔ سانس روک کر میں نے اوپر نکلنے کی کوشش کی۔ ہیرا بھی جو میری رفاقت میں تھا، اوپر کو بڑھا۔ اس دھویں بھری گیس سے ہیرا کا بھی دم بُری طرح گھُٹ رہا تھا لیکن وہ بھی جدوجہد چھوڑنے والا نہیں تھا۔ آخر کار ہم اس دھویں کی چادر سے اُوپر اُٹھ آئے یہاں ہوا صاف تھی اور جونہی میں نے اپنی آنکھوں سے جھلّی ہٹائی تو مجھے دور بھورے آسمان کے نیچے اپنی لائن (چھاؤنی) نظر آئی۔ ہم اس کی جانب اڑ چلے۔

ہم نے اپنے ٹھکانے کی طرف مشکل سے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا جب ایک خوفناک عقاب (جہاز) ہمارے قریب آ گیا۔ اس کے پورے جسم پر کراس (صلیب) کے سیاہ نشان تھے۔ اُس نے ہم پر آگ اُگل دی۔ پک پف۔ پک پف۔ پاپ۔ پا (کی آواز کے ساتھ) ہم نے نیچے ڈبکی لگا دی اور پورا زور لگایا۔ ہم پلٹ کر اُس عقاب کے پیچھے کی طرف چلے گئے وہاں وہ مشین ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتی تھی۔ تصور کیجیے کہ ہم اُس عقاب جیسی مشین کی دُم سے اُوپر اُڑ رہے ہیں۔ اب یہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے چکر کاٹنے شروع کر دیئے ہم نے بھی ویسا ہی کیا۔ اُس نے قلابازی لگائی۔ ہم نے بھی ویسا ہی کیا۔ اپنی دُم کو مروڑے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اصلی

عقاب کی دُم کے برعکس اُس کی دُم مُردہ مچھلی کی طرح سخت اور اکڑی ہوئی تھی۔ ہمیں پتہ تھا کہ اگر ہم ایک بار اس کے سامنے آ گئے تو فوراً مارے جائیں گے۔

وقت گزر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم اُس مشینی عقاب کی دُم کے اوپر ہمیشہ کے لیے اڑتے نہیں رہ سکتے۔ گیس کے دھویں سے بھرا گاؤں جو ہم چھوڑ کر آئے تھے اُس کی حفاظت رسالدار اور اُس کے ساتھی کر رہے تھے۔ ہمیں ان کی سلامتی اور کمک کے لیے جلد سے جلد پیغام پہنچانا ضروری تھا۔

اُسی لمحے مشینی عقاب نے چکر دے کر اپنے ٹھکانے کی جانب واپس اڑنا شروع کر دیا۔ ہم اُس کی دُم کے اوپر اڑتے ہوئے دشمن کی چھاؤنی میں نہیں جانا چاہتے تھے جہاں اچوک نشانے باز ہمارا پُرزہ پُرزہ بکھیر دیتے۔ اب جبکہ ہم اپنے گھر کے آدھے راستے میں تھے جہاں سے ہماری چھاؤنی دکھائی دے رہی تھی ہم نے احتیاط چھوڑ دی۔ ہم نے مشینی عقاب سے اُلٹے رُخ کو انتہائی تیز رفتار سے اڑنا شروع کر دیا اور اپنے پنکھوں کی چند جستوں کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ اونچے اٹھتے گئے۔ ہم نے ایسا کیا ہی تھا کہ وہ منحوس جانور پلٹ کر ہمارا پیچھا کرنے لگا خوش قسمتی سے اُسے ایسا کرنے میں کچھ وقت لگا۔ اب اس میں شک نہیں تھا کہ ہم اپنی چھاؤنی کے اوپر اُڑ رہے تھے، پھر بھی وہ جہاز اوپر اڑ کر ہماری سطح پر آ گیا اور ہم پر آگ برساتا رہا۔ ''پف پف۔ پاپ۔ پا'' اب ہمیں پھر مجبوراً ڈبکی پر ڈبکی لگانی پڑی۔ میں نے ہیرا کو اپنے نیچے ہی اڑائے رکھا۔ اس سے وہ محفوظ رہا۔ اس طرح ہم اڑتے رہے لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ کہیں سے ایک مشینی عقاب آیا اور اس نے دشمن پر فائر کئے۔ اب ہم نے خود کو اس قدر محفوظ سمجھا کہ ہیرا اور میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے اڑنے لگے۔ تبھی ایک گولی میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزری اور اُس نے ہیرا کے پنکھ توڑ دیئے۔ آہ بیچارا زخمی ہیرا! اُس نے چکّر کھایا اور ہوا میں سے ہوتا ہوا چاندی کے ورق کی طرح گرا۔ خوش قسمتی سے وہ ہماری چھاؤنی میں گرا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ مر گیا ہے میں بجلی کی سی تیز رفتاری سے اڑا اور پھر واپس مڑ کر ان دو عقابوں کی لڑائی پھر دوبارہ نہ دیکھ پانے کے لیے۔

جب میں ٹھکانے پر پہنچا تو مجھے کمانڈر اِن چیف کے پاس لے جایا گیا۔ اُس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔ تب میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میں کتنا اہم سندیش لے کر آیا تھا جونہی اُس بوڑھے نے اُس کاغذ کے ٹکڑے کو پڑھا اُس نے ایک انوکھی سی کھٹ کھٹ کرنے والی مشین کو چھوا۔ ایک سینگ کا ٹکڑا اٹھایا اور اُس میں غرّایا۔ اب گھونٹ مجھے میرے آشیانے میں لے گیا۔ وہاں جا کر جب میں بیٹھا اور ہیرا کے بارے میں سوچنے لگا تو مجھے اپنے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مشینی عقاب ہوا میں ٹڈی دل کی سی تعداد میں اڑ رہے تھے۔ وہ چنگھاڑتے، منڈلاتے اور بھونکتے تھے۔ نیچے زمین سے بے شمار مشینی کتّے غراتے اور دھماکے کرتے تھے۔ اب آگ اگلنے والی بڑی توپوں کی دہاڑ سنائی دینے لگی۔ ایسا لگا جیسے پورے جنگل کے شیر پاگل ہو اٹھے ہوں۔ گھونٹ نے میرے سر پر تھپکی دی اور کہا ''تُم نے دن بچا لیا ہے۔'' لیکن دن تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے تو اندھیرا ابھرا بھورا آسمان تھا جس کے نیچے موت اژدہا کی طرح بل کھاتی اور چیختی تھی اور ہر چیز کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر کچل رہی تھی۔ آپ اِسی سے حساب لگائیے کتنی بُری بات ہے۔ جب میں اگلی صبح ورزش کے لیے اپنے اڈّے کی طرف گیا تو میں نے دیکھا کہ میرے گھونسلے سے بمشکل ایک میل دور زمین پر گولہ باری نے ہل سا چلا دیا تھا یہاں تک کہ گھریلو چوہے اور کھیتوں کے جنگلی چوہے بھی اس گولہ باری سے بچ نہیں پائے۔ درجنوں وہاں قتل ہو گئے تھے اور کٹ کر ٹکڑے ہوئے پڑے تھے۔ آہ کتنا بھیانک منظر تھا۔ میں بہت غمگین ہُوا۔ اب جب ہیرا مر چکا تھا میں اکیلا رہ گیا تھا، غمزدہ اور آزردہ۔''

گھونٹ کا جائزہ کے لیے جانا

دسمبر کے پہلے ہفتے میں گھونٹ اور رنگیلا کو آزادانہ طور پر ایک تحقیقی دورے پر جانا تھا۔ جس مقام کو وہ گئے وہ ایک جنگل تھا جو یاپرس، آرمن ٹیئرِیس اور ہیزبروک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر آپ فرانس کا نقشہ اٹھا کر دیکھیں اور کیلائس سے جنوب کی طرف ایک سیدھی لکیر کھینچیں تو آپ کو ایسے مقامات کی ایک لڑی ملے گی جہاں برطانوی اور ہندوستانی فوجیں مقیم تھیں۔ آرمن ٹیئرس کے قریب ہندوستانی مسلمان سپاہیوں کی بہت سی قبریں موجود ہیں۔ ہندوستان کے ہندو سپاہیوں کی قبریں وہاں نہیں ہیں چونکہ ہندو نامعلوم یگوں یگوں سے اپنے مُردوں کا داہ سنسکار کرتے رہے ہیں۔ اور جن کو جلا دیا جاتا ہے ان کی قبریں نہیں بنتیں۔ ان کی راکھ ہوا میں بکھیر دی جاتی ہے اور کوئی جگہ ان کی حامل یا نشان دِہ نہیں ہوتی۔

چلئے اب گھونٹ اور رنگیلا کی طرف لوٹتے ہیں۔ انہیں ہیزبروک کے نزدیک ایک جنگل میں بھیجا گیا جو دشمن کی چھاونی کے عقب میں واقع تھا۔ انہیں اُس جگہ کا صحیح صحیح پتہ لگانا تھا جہاں اسلحہ کا ایک بہت بڑا زیرِ زمین ذخیرہ تھا۔ گھونٹ کو اور کبوتر کو اکیلے طور پر یا دونوں نے ایک ساتھ اُس جگہ کا صحیح نقشہ لے کر برطانوی افواج کے صدر دفتر میں لوٹنا تھا، بس اتنا ہی ----- چنانچہ دسمبر کی ایک روشن صبح کو رنگیلا کو ایک ہوائی جہاز میں لے جایا گیا۔ اس جہاز نے ایک جنگل کے اوپر سے کوئی بیس میل کی اڑان بھری۔ اس جنگل کا کچھ حصہ بھارتی افواج کے قبضے میں تھا اور باقی جرمنوں

کے قبضے میں۔ جب وہ جرمنوں کی چھاؤنی سے آگے پہنچے تو رنگیلا کو چھوڑ دیا گیا۔ رنگیلا ان پورے کے پورے جنگلوں کے اوپر اڑتا رہا۔ تب اس زمین کی نوعیت کے بارے میں کچھ آگاہی حاصل کر کے واپس اڑ کر اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔ ایسا یہ یقینی بنانے کے لیے کیا گیا کہ رنگیلا کو اپنے راستے کا پورا علم ہے۔ اور اُسے اُس نشانے کی بھی خبر ہے جو اُس سے مطلوب ہے۔

اُس دن دوپہر بعد جب سورج اُفق کی جانب جھک چکا تھا، جو کہ نیویارک سے دس درجہ شمال کے عرض بلد پر واقع اس علاقے میں لگ بھگ چار بجے ہوتا ہے، گھونٹ بھاری گرم کپڑوں میں ملبوس اور اپنے کوٹ کے نیچے رنگیلا کو ڈھکے ہوئے روانہ ہوا۔ وہ اُس وسیع جنگل میں بھارتی فوج کی دوسری دفاعی حد تک ایک ایمبولینس میں گئے۔ گھُپ اندھیرے میں وہ جاسوسی عملے کے کچھ ارکان کی رہنمائی میں محاذِ جنگ کی جانب روانہ ہوئے۔

جلد ہی انہوں نے خود کو ایک غیر متنازعہ علاقے میں پایا جو دونوں فریقین میں سے کسی کے قبضے میں نہ تھا۔ خوش قسمتی سے یہ درختوں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں سے بیشتر ابھی گولہ باری سے تباہ نہیں ہوئے تھے۔ گھونٹ کو، جو نہ تو فرانسیسی زبان جانتا تھا اور نہ ہی جرمن بھاشا، اور جس کا انگریزی زبان کا علم بھی صرف تین الفاظ یس، نو اور ویری ویل تک ہی محدود تھا، اب اُس جنگل میں چھوڑ دیا گیا تھا، تاکہ جرمنوں کے اسلحہ کے ذخیرے کا پتہ لگائے۔ اس کے ہمراہ صرف ایک کبوتر تھا جو اُس کے کوٹ کے نیچے گہری نیند سو رہا تھا۔

سب سے پہلے تو اُسے خود کو یہ یاد دلانا ضروری تھا کہ وہ ہمالیائی خطّے والی آب و ہوا رکھنے والے علاقے میں ہے جہاں موسمِ سرما میں درخت ننگ دھڑنگ کھڑے ہوتے ہیں اور زمین پت جھڑ کے خشک پتوں اور پالے سے ڈھکی ہوتی ہے۔ چونکہ پیڑوں اور پودوں پر پتے برائے نام ہوتے ہیں، اپنے آپ کو چھپانا اُس کے لیے کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا۔ رات اندھیری تھی اور ایک لاش کی طرح سرد۔ لیکن چونکہ وہ اندھیرے میں کسی بھی زندہ انسان سے بہتر دیکھ سکتا تھا اور اُس کی سونگھنے کی حس بھی سبھی جانداروں سے تیز تھی وہ اس غیر مقبوضہ علاقے میں اپنا راستہ سادھنا

بخوبی جانتا تھا۔ قسمت کی خوبی یہ ہے کہ اس رات ہوا بھی مشرق کی جانب سے چل رہی تھی۔

درختوں کے تنے کے بیچ میں سے اپنا راستہ نکالتا ہوا وہ جتنا تیز چل سکتا تھا آگے بڑھتا رہا۔ اُس کی ناک نے اُن کی آمد سے چند منٹ پہلے اُسے بھنک دے دی کہ جرمن فوج کی ایک کمپنی اُس کے راستے سے گزرنے والی ہے۔ وہ تیندوے کی طرح رینگ کر ایک درخت پر چڑھا اور وہاں انتظار کرنے لگا۔ انہیں کسی آواز کی سرسراہٹ بھی سنائی نہیں دی۔ اگر دن کی روشنی ہوتی تو وہ پکڑا جاتا چونکہ کُہرے سے ڈھکی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں چلتے چلتے اُس کے پیروں سے خون رِس رہا تھا اور اپنے پیچھے نمایاں نشان چھوڑ رہا تھا۔

ایک بار تو وہ بال بال بچا۔ جب وہ ایک پیڑ پر چڑھ کر ایک ڈالی پر جا بیٹھا تو اُس نے دوسری ٹہنی سے کسی کو اُس کے کان میں سرگوشی کرتے سُنا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ شخص ضرور کوئی جرمن نشانہ باز ہے۔ لیکن اُس نے اپنا سر جھکایا اور غور سے سننے لگا۔ جرمن بولا ''گتین ناکٹ'' تب اُس نے قدم اُٹھایا اور پیڑ سے نیچے اتر گیا۔ بلاشبہ اُس نے گھونڈ کو اپنا کوئی ساتھی سپاہی سمجھا جو اُس کی جگہ ڈیوٹی سنبھالنے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھونٹ زمین پر اُترا اور اُس جرمن کے پاؤں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اگرچہ اندھیرا تھا لیکن اُس کے ننگے پاؤں یہ محسوس کر سکتے تھے کہ زمین اُس جرمن کے قدموں سے کہاں کہاں پر دبی ہوئی ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔

آخر کار وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بہت سارے لوگ رات کا پہرہ دے رہے تھے۔ بغیر آہٹ کئے، اُن سے بچ بچا کر، اُن کے گرد گھومتے ہوئے اُسے آگے بڑھنا پڑا تب اُس نے بالکل اپنے قدموں کے نیچے ایک انوکھا سا شور سُنا۔ وہ رُکا اور سُننے لگا۔ بے شک وہ ایک مانوس آواز تھی۔ اُس نے انتظار کیا۔ ایک جانور کے قدموں کے نشان تھے۔ ''پاٹر۔ پیٹ۔ پاٹرر۔۔۔ ر۔۔۔ر'' کیا آواز آئی۔ گھونٹ اُس آواز کی جانب بڑھا۔ ایک دبی دبی سی غراہٹ سنائی دی۔ خوف کی جگہ اُس کے دل میں خوشی بڑھ گئی۔ وہ شخص جس نے ہندوستان کے جنگلوں میں شیروں سے بھرے جنگلوں میں راتیں کاٹی تھیں بھلا ایک جنگلی کتے کی غراہٹ سے ڈر جاتا؟ جلد ہی اُس کی

نگاہوں نے دوسُرخ آنکھوں کا سامنا کیا۔ گھونڈ نے وہاں کھڑے کھڑے اپنے سامنے کی ہوا کو
احتیاط سے سونگھا۔ اُس کتے کے آس پاس کسی انسان کی ذرا سی بھی بواُسے محسوس نہیں ہوئی۔ وہ
جانور جنگلی ہوگیا تھا۔ کتا بھی یہ جاننے کے لیے ہوا سونگھ رہا تھا کہ اُس کے مقابل کس قسم کا جاندار
کھڑا ہے۔ گھونڈ کے جسم سے کسی ڈرے ہوئے انسان کی طبعی بو نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ وہ کتا آگے
آیا اور اُس کے ساتھ اپنے بدن کو رگڑ رگڑ کر اُس نے بہت گہرائی سے سونگھا۔ خوش قسمتی سے گھونڈ رنگیلے
کو اُس کتے کی ناک کے عین اوپر اٹھائے ہوا تھا۔ پرندے کی موجودگی کی بو ہوا میں پھیلی۔ تب کتے
نے سمجھ لیا کہ سامنے کھڑا آدمی محض ایک نڈر اور دوستی رکھنے والا شخص ہے۔ اُس نے اپنی دُم ہلائی
اور نرم آواز میں کراہنے لگا۔ گھونڈ نے اُس کے سر پر آہستہ سے تھپکی دینے کی بجائے آہستہ سے اپنا
ہاتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا تا کہ وہ اُسے دیکھے اور سونگھے۔ اس کے بعد غیر یقینی کیفیت کا
ایک لمحہ گزرا۔ کیا کتا اُس ہاتھ کو کاٹ لے گا؟ ایک اور لمحہ اسی طرح بیت گیا تب —— کتا اُس
ہاتھ کو چاٹنے لگا۔ اب وہ خوشی کے جذبے سے منمنایا۔ گھونڈ نے دل ہی دل میں کہا: ''تو یہ شکاری
کا کتا ہے اور اناتھ ہے، بنا مالک کے رہ گیا ہے غالباً اس کا مالک مر چکا ہے۔ اب یہ بیچارہ اس قدر
جنگلی ہوگیا ہے جتنا کہ بھیڑیا۔ یہ غریب جانور جرمن فوج کی رسد کا شکار کر کے پیٹ پال رہا ہے
چونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ ابھی تک اس نے کسی انسان کا گوشت نہیں کھایا۔ یہ تو اور بھی اچھی بات
ہے۔''

گھونڈ نے مدھم سُر میں سیٹی بجائی۔ یہ ہر دور کے سبھی شکاریوں کی آواز ہے چاہے وہ
کسی ملک کے ہوں۔ اس کا مطلب ہے ''آگے آگے چلو'' اور کتا آگے آگے چلنے لگا۔ اُس نے
دبے پاؤں رات کے پہرے دار سپاہیوں کے باہر باہر سے اس طرح نکل کر گیا جیسے کوئی بارہ سنگھا
شیر کی ماند (گپھا) کے پاس سے دبے پاؤں کھسک جاتا ہے۔ کئی گھنٹوں تک مارے مارے
پھرنے کے بعد وہ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ اب اس میں غلطی کا شائبہ نہیں تھا۔ اب گھونڈ نے نہ
صرف اسلحہ کا ڈپو کھوج نکالا تھا بلکہ جرمن رسد گاہ کا گودام بھی۔ اُس کا رہبر وہ جنگلی کتا زمین کے

ایک خفیہ سوراخ میں گھس گیا۔ تب آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے جبڑوں میں ایک بچھڑے کی لمبی سی
ٹانگ تھامے ہوئے وہاں سے نمودار ہوا۔ گھونڈ نے اُس کی بُو سے ہی بتا دیا کہ وہ کسی گائے بیل کا
گوشت ہے۔ کتا کہرے سے لدی زمین پر اپنا رات کا کھانا کھانے بیٹھ گیا جبکہ آدمی نے اپنے
بوٹ پہن لیے جو اُس نے رات بھر اپنے کندھوں کے ساتھ لٹکائے رکھے تھے۔ تب اُس نے اوپر
سر اُٹھا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ ستاروں کے مقامِ وقوع سے وہ بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہاں
اُس نے کچھ دیر انتظار کیا۔

آہستہ آہستہ دن چڑھنے لگا۔ اپنی جیب سے اس نے قطب نما آلہ (کمپاس) نکالا۔ جی
ہاں! اُسے یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ اس جگہ کا نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ تبھی کتا اوپر کو کودا اور اُس نے گھونڈ کا
کوٹ اپنے دانتوں میں پکڑ لیا۔ آدمی کے ذہن کو اب اس میں شک نہ تھا کہ کتا اُسے ایک بار پھر
کہیں لے جانا چاہتا ہے۔ وہ آگے آگے دوڑنے لگا اور گھونڈ بھی اُسی تیزی کے ساتھ پیچھے پیچھے
چل دیا۔ جلد ہی وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو کانٹوں اور برف کے باعث جمی ہوئی انگور کی بیلوں
کے اتنے گھنے ڈھیر سے ڈھکی ہوئی تھی کہ اس میں سے گزرنا صرف کسی جانور ہی سے ممکن تھا۔ کتا
بے شمار نوکیلے کانٹوں میں سے گزرتا ہوا کہیں غائب ہوگیا۔ اب گھونڈ نے کاغذ پر ایک نقشہ کھینچا
جس میں ستاروں کا محلِ وقوع اور اس قطب نما کا بتایا ہوا اشارہ ایک کاغذ پر درج کر کے رنگیلے کے
پاؤں سے باندھ دیئے اور اُسے آزاد چھوڑ دیا۔ وہ پرندے کو دیکھتا رہا جو ایک درخت سے دوسرے
درخت تک اڑتا، پھر وہاں منٹ بھر بیٹھ کر اپنے پنکھوں کو سہلاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے پاؤں کے
ساتھ بندھے ہوئے پیغام کو اپنی چونچ سے ٹٹولا۔ شاید وہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ یہ حفاظت سے
بندھا ہوا ہے یا نہیں۔ پھر وہ اڑ کر سب سے اونچے پیڑ کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ وہ وہاں بیٹھا اس دھرتی
کے محلِ وقوع کا جائزہ لیتا رہا۔ اُسی لمحہ گھونڈ نے جو اوپر کو ہی دیکھ رہا تھا محسوس کیا کہ کوئی چیز اُسے
کھینچ رہی ہے۔ اس نے نیچے پیروں کی طرف دیکھا۔ کتا اُسے گھسیٹ کر کانٹوں کے نیچے ایک غار
کی طرف لے گیا۔ گھونڈ اس میں جھکا، لیکن اس قدر جھکا کہ اپنے وفادار مشیر کی ہدایت پر عمل کر

سکے۔لیکن اُسی دم اُس نے اپنے سر کے اوپر پنکھوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی اور پھر بندوقوں کا بھونکنا (فائر) شروع ہوگیا۔اب اسے یہ خواہش نہ رہی کہ وہ اٹھ کر اس بات کی تحقیقات کرے کہ رنگیلا اس گولی باری میں مارا گیا یا نہیں۔وہ کانٹوں کے نیچے رینگتا رہا یہاں تک کہ اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کا پیٹ ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ جڑ گیا ہے اور یہ دونوں گویا زمین کے ساتھ کس کر سی دیئے گئے ہیں۔وہ آگے آگے رینگتا گیا یہاں تک کہ اچانک وہ پھسل کر لگ بھگ آٹھ فٹ نیچے ایک تاریک غار میں جا گرا۔وہاں گھپ اندھیرا تھا لیکن گھونڈ نے پہلے یہ نہیں دیکھا چونکہ وہ اپنے سر کو سہلانے میں مصروف تھا جس پر خراشیں آگئی تھیں۔

آخر جب اُس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہے تو اُسے یہ سمجھ میں آیا کہ وہ منجمد پانی کے ایک سوراخ پر بیٹھا ہے جو چوروں کے غار کی طرح ناقابلِ عبور کانٹے دار جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔موسمِ سرما میں بھی جب شاخوں اور سر کے اوپر لٹکی ہوئی انگور کی بیلوں پر سے پتے جھڑ چکے ہوتے ہیں، دن کے وقت بھی وہاں گھنا اندھیرا تھا۔کتا ابھی تک اُس کے ساتھ تھا اور بظاہر اُسے سلامتی اور حفاظت کی جگہ تک کھینچ لایا تھا۔وہ غریب جانور ایک دوست کو پا کر اس قدر خوش تھا کہ وہ اس وقت گھونڈ کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن گھونڈ کو نیند آرہی تھی وہ قریب ہی برپا توپوں کے شور و غل کے باوجود اونگھنے لگا اور پھر مکمل نیند میں کھو گیا۔

لگ بھگ تین گھنٹے بعد کتا دفعتاً دردناک لہجے میں کراہنے اور چلانے لگا جیسے اُس پر پاگل پن سوار ہوگیا ہو۔اُس کے بعد دھماکوں کی ہیبت ناک آوازوں کے ساتھ زمین ڈولنے لگی۔ کتے کے لیے یہ آوازیں ناقابلِ برداشت تھیں۔وہ گھونڈ کے کوٹ کی آستینوں کو کھینچتا رہا۔وہ دھماکے قیامت پر قیامت اٹھاتے رہے حتیٰ کہ جہاں گھونڈ لیٹا ہوا تھا وہ جگہ صحیح معنوں میں ایک جھولے کی طرح جھولنے لگی۔لیکن اُس نے اپنی چھپنے کی جگہ کو چھوڑا نہیں۔اُس نے خود سے بس اتنا کہا: ''او رنگیلے! لاجواب پرندے! تو نے کس خوبی سے اپنا کام سرانجام دیا ہے تو نے پہلے ہی اُس شاہ دانہ (چیری) جیسے چہرے والے سردار تک وہ سندیش پہنچا دیا اور یہ ہے اُس کا کڑک دار

جواب۔اے پنکھوں والی مخلوق کے موتی!'' وہ اس طرح بڑبڑاتا رہا جبکہ ہوائی جہازوں سے گرائے گئے بم جرمنوں کے اسلحہ کے ذخیرے کو نذرِ آتش کرتے رہے۔

تب وہ کتا جو اُس کے کوٹ کی آستین پکڑ کر اُسے کھینچ لے جانے کی کوشش کرتا رہا تھا کراہنے اور کانپنے لگا جیسے کوئی تیز بخار سے کانپتا ہے۔اُسی لمحہ کوئی چیز ہوا میں چھنچھناتی ہوئی آئی اور ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ نزدیک آگری۔بے چارہ [illegible] ناامیدی بھری کراہ کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے باہر کو لپکا۔گھونڈ بھی پیچھے پیچھے بھاگا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ابھی وہ کانٹوں کے نیچے آدھے رستے تک ہی رینگ پایا تھا کہ جب ایک سمع خراش دھماکے نے جیسے اُس کے نیچے کی دھرتی کاٹ ڈالی اور ایک تیکھے درد نے اُس کا کندھا چیر دیا۔اُس نے محسوس کیا کہ کوئی شیطانی طاقت اُسے اٹھا کر پٹک رہی ہے، اور وہ بڑے زور سے زمین پر آگرا۔کچھ لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی کے سُرخ ہیرے ناچتے رہے اور پھر سرد اندھیرا چھا گیا۔

ایک گھنٹہ بعد جب اُسے ہوش آیا تو پہلی چیز جو اُس کے علم میں آئی وہ کچھ ہندوستانی آوازیں تھیں۔اپنے وطن کی زبان کو مزید واضح طور پر سننے کے لیے اُس نے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی۔اُسی پل اس کو تڑپا دینے والا درد محسوس ہوا جیسے ہزاروں پھنیئر سانپوں نے اُسے ایک ساتھ ڈس لیا ہو۔اُس کے دل میں اب اس بات کا کوئی شک نہیں رہا کہ اُسے گولی لگی ہے اور وہ غالباً مہلک طور پر زخمی ہوا ہے۔اس کے باوجود ہر مرتبہ جب اپنے پاس وہ کسی کو ہندوستانی زبان بولتے ہوئے سنتا، تو اُس کی روح کو مسرت ہوتی چونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ جنگل ہندوستانی فوج کے قبضے میں ہے۔وہ خود سے کہتا۔'' آہا اب میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔اب میں سکون سے مر سکتا ہوں۔''

رنگیلے نے سندیش کیسے پہنچایا

''اُس معرکہ خیز دن سے پہلے والی پوری رات میں بہت کم سویا۔ اگرچہ میں اُس کے کوٹ کے نیچے پڑا تھا، لیکن گھونڈ کو یہ علم نہیں تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ آپ کو ایسے آدمی کے دل کے پہلو میں کیسے نیند آسکتی ہے جو ہر آدھے گھنٹے بعد ایک بارہ سنگے کی طرح دوڑتا ہو، گلہری کی طرح درختوں پر چڑھتا ہو اور اجنبی کتوں کو اپنی رفاقت کے لیے چُن لیتا ہو۔ گھونڈ کا دل کبھی کبھی اتنی شدت سے دھڑکتا تھا کہ آپ گزوں دور سے اُس کی دھڑکن سُن سکتے تھے۔ وہ ایک اور کام کرتا تھا جس سے اُس کے اس قدر نزدیک رہ کر کوئی سونے کی طرف مائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس رات اُس کی سانس بہت بے قاعدگی سے چلتی رہی۔ کبھی کبھی وہ بہت لمبے سانس لیتا، کبھی وہ اتنی تیزی سے سانس لیتا جیسے کوئی بلّی سے جان بچا کر بھاگتا ہوا چوہا لیتا ہے۔ میرے لیے ایسے آدمی کے کوٹ کے نیچے سونا آسمان کے طوفان میں سونے کی کوشش جیسا تھا۔

تب وہ کتا! کیا میں کبھی اُسے بھول سکوں گا؟ جب گھونڈ نے پہلی بار اُسے ساتھ لیا تو میں ڈر گیا تھا لیکن اُس نے میرے بدن سے کوئی بو نہیں لی۔ اور نیچے سے جو ہوا اٹھ رہی تھی اُس سے مجھے ایسا لگا کہ ہو نہ ہو ایک پاکیزہ مہک والی آتما کی طرح وہ ہمارے ساتھ دوستی کرنے آیا ہے۔ اُس کے نقشِ قدم میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ وہ ایسے دبے پاؤں چلتا تھا جیسے بلّی۔ وہ ضرور

کوئی جنگلی کتا ہی رہا ہوگا چونکہ جو کتے شہری تہذیب میں رہتے ہیں ہنگامہ پسند ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی سے چل بھی نہیں سکتے۔ انسان کی صحبت جانوروں کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔ سوائے بلّی کے ہر ایک جانور انسان کی کی صحبت میں آکر لاپروا اور شور مچانے والا بن جاتا ہے۔ لیکن وہ کتا بالکل جنگلی تھا۔ وہ چلتے ہوئے شور نہیں کرتا تھا۔ بغیر آواز کے سانس لیتا تھا پھر بھی مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ وہاں موجود ہے۔ یہ اُس خوشبو کی وجہ سے ہوا جو دھرتی سے اٹھی اور جس نے میرے نتھنوں کو خوش آمدید کہا۔

ایک بے خواب، اور حد درجہ بے آرام رات کے بعد گھونڈ نے مجھے چھوڑا تھا۔ اب میں بھی مشکل سے پہچان سکا کہ اُس نے مجھے کس مقام پر آزاد کیا تھا۔ چنانچہ مجھے ایک درخت سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک اڑ کر اپنے گرد و پیش کی آگاہی حاصل کرنے کے لیے بیٹھنا پڑا جس نے میری روح میں ایک خوف بھر دیا چونکہ اب جبکہ دن چڑھ چکا تھا، درختوں پر نظریں لگنے لگی تھیں۔ انوکھی نیلی آنکھیں کئی نلیوں میں سے مختلف سمتوں میں دیکھ رہی تھیں۔ ان نلیوں کے پیچھے آدمی تھے اور ایک نلی تو اُس درخت کی چوٹی سے دیکھ رہی تھی جو اس جگہ سے محض ایک فٹ دور تھی جہاں میں بیٹھا تھا۔ اُس نے میری آمد کی آہٹ نہیں سنی چونکہ ہمارے ارد گرد دھات کے کتے بھونک رہے تھے پف پاپاپا پک۔

لیکن جب میں اڑا تو اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے جلدی نہ کی اور دوسرے درختوں کے نیچے چھپ نہ گیا تو وہ مجھے نشانہ بنائے گا۔ اور اُس نے کئی بار فائر بھی کیا لیکن میں ایسی جھاڑی کے پیچھے تھا جو کسی رشی کی گُندھی ہوئی جٹاؤں جتنی گھنی تھی۔ میں نے اڑنے کی بجائے ایک درخت سے دوسرے اور پھر تیسرے تک کودنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ سامنے کی فضا خطرے سے محفوظ نہ ہو۔ اسی ترکیب سے لگ بھگ آدھا میل طے کرنے میں کافی دیر لگی۔ آخر کار اس عمل میں میرے پاؤں بہت تھک گئے اور میں نے اڑ کر جانے کا فیصلہ کیا، خواہ خطرہ ہو یا نہ ہو۔

خوبیٔ قسمت سے کسی نے مجھے اڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہوا میں وسیع چکر کاٹتا ہوا میں بہت اونچا نکل گیا۔ ایک ایسے مقام سے جہاں سے درختوں کا جنگل ایک ننھے پودے جتنا چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے مختلف سمتوں میں نگاہ ڈالی۔ مشرق میں بہت دور سونے کے رتھوں کی مانند ہوائی جہازوں کا ایک جھنڈ طلوعِ آفتاب کے آسمان کے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میں نے زیادہ دیر انتظار کیا تو دشمن مجھ کو آ لے گا۔ چنانچہ میں مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ درختوں کی چوٹیوں پر بیٹھے ہزار نشانہ بازوں کے لیے ایک طرف کا اشارہ تھا کہ مجھ پر گولی چلائیں۔

میرا خیال ہے کہ جب میں نے ان کے درختوں کے اوپر چکر کاٹے تو جرمنوں کو پورا یقین نہیں تھا کہ میں ان کا پیغام رساں ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن جونہی نشانہ بازوں نے یہ دیکھ لیا کہ میں مغرب کی جانب جا رہا ہوں تو انہیں یقین ہو گیا کہ میں اُن کا قاصد نہیں، لہٰذا مجھے مار گرانے کے لیے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ میں اپنے پیروں پر بندھا ہوا کیا لے جا رہا ہوں، انہوں نے مجھ پر گولیاں چلائیں۔

موسمِ سرما کی صاف ہوا میں بنا منجمد ہوئے میں مسلسل بہت اوپر نہیں جا سکتا تھا، نیز کسی صورت یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کے جہاز مجھ تک آ پہنچیں۔ میں پھر مغرب کی طرف تیزی سے بڑھا۔ گولیوں کی دیوار پھر میرے سامنے موت کے تیروں کی طرح پھیل گئی۔ لیکن میرے سامنے اور کوئی متبادل نہیں تھا۔ یا تو اس دیوار کو چیر کر اپنا راستہ نکالوں یا پیچھا کرنے والے ہوائی جہازوں کے ہاتھوں مارا جاؤں جو اتنے نزدیک آ چکے تھے کہ میں ان میں سوار لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا میں مغرب کی جانب سرپٹ بھاگا۔ خوش قسمتی سے میری دُم جو ایک مہینہ پہلے زخمی ہو گئی تھی، اب تقریباً اپنے معمول کے ماپ کی ہو گئی تھی۔ اِس آنکس کے بغیر میرا کام دُگنا مشکل ہوتا۔ جب میں اپنی چھاؤنی کی طرف بڑھتا ہی گیا تو گولی باری کی باڑھ اور گھنی ہو گئی۔ اب اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سبھی نشانہ باز اور خندقوں میں چھپے سپاہی مجھی پر نشانہ سادھ رہے تھے۔ لیکن میں ٹیڑھی میڑھی چال

سے اڑا۔ میں نے چکر کاٹے اور کبھی قلابازیاں لگائیں اور در حقیقت وہ سبھی حیلے اور ہتھکنڈے استعمال کیے جو میں لگاتار بڑھتی اس گولیوں کی لگاتار بڑھتی بھیڑ کو چکمہ دینے کے لیے جانتا تھا۔ لیکن اس پیچ در پیچ اڑنے کی کارروائی میں میرا بہت وقت ضائع ہوا۔ ایک ہوائی جہاز تو اس قدر نزدیک آ گیا کہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے اوپر سے اور پیچھے سے ڈھیروں آگ برسائی لیکن اب سوائے آگے بڑھتے رہنے کے کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا میں اندھا دُھند منہ اٹھائے بڑھتا ہی گیا۔ اوہو! کتنا جلد اور کتنا تیز —— تیز ترین طوفان جتنا تیز —— تب فٹافٹ —— مجھے گولی لگی۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ران کے جوڑ کے قریب۔ اور یہ ٹانگ اپنے ساتھ بندھے ہوئے پیغام کے ساتھ یوں لٹک گئی جیسے کسی باز کے ایک پنجے میں چڑیا۔ ہائے! وہ درد جو اُس وقت اٹھا لیکن اس کے بارے میں سوچنے کو میرے پاس وقت نہیں تھا چونکہ وہ جہاز ابھی تک میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ مجھے اور بھی تیز اڑنا پڑا۔

آخر کار ہماری چھاؤنی نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ میں نیچے کو اڑا۔ اُس جہاز نے بھی نیچے کو غوطہ لگایا۔ میں نے قلابازی کھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ اب میرا کوئی بھی حربہ آزمانے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ تب پا۔ پا۔ پٹ۔ ٹپٹ۔ میری دم کو گولی لگی اور پروں کی بوچھاڑ نیچے پھیل گئی جس نے جرمن فوجوں کی خندقوں میں سپاہیوں کی نگاہوں کو ایک لمحہ کے لیے دھندلا دیا چنانچہ میں ایک ٹیڑھی لکیر کی سورت اڑتا ہوا اپنی چھاؤنی کو لپکا اور ایک دائرہ بنا کر اس سے گزر گیا۔ تب میں نے عجیب منظر دیکھا۔ اُس جہاز کو ہمارے فوجیوں نے نشانہ بنایا۔ وہ جھولنے لگا، پھر ایک طرف کو پلٹا اور گر گیا لیکن اس میں آگ لگنے سے پہلے جو زیادہ سے زیادہ نقصان وہ کر سکتا تھا اس نے کر دیا۔ اُس نے گولی مار کر میرا دایاں پنکھ توڑ دیا۔ فضا میں ہی اس جہاز کو آگ لگتی اور اُسے گرتا دیکھ مجھے اطمینان ہوا۔ پھر بھی میرا اپنا درد بہت بڑھ گیا تھا۔ اس قدر کہ مجھے لگا جیسے بیس شکرے چیر کر مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ لیکن میری نسل کے دیوتاؤں کا بھلا ہو کہ مجھے نہ درد کا ہوش رہا نہ خوشی کا اور بس مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی پہاڑ جتنا وزن مجھے نیچے کی

طرف کھینچ رہا ہے۔

مجھے ایک ماہ تک انہوں نے کبوتروں کے شفا خانے میں رکھا۔ اگر چہ میرے پنکھ کی مرمت کر دی گئی اور ٹانگ کو بھی اُسی جگہ پر سی دیا گیا جو اس کی اصل جگہ تھی لیکن وہ مجھے دوبارہ اڑنے لائق نہیں بنا سکے۔ جب کبھی میں اوپر ہوا میں کودتا تھا، نامعلوم کیوں میرے کان توپوں کے بھیانک شور وغل سے بھر جاتے اور میری آنکھوں کو سوائے آگ لگاتی گولیوں کے کچھ نظر نہ آتا۔ میں اس قدر خوفزدہ ہو جاتا کہ فوراً زمین کی طرف لپکتا۔ آپ کہیں گے کہ میں خیالی توپوں کی آوازیں سنتا تھا اور گولیوں کی تصوراتی دیواریں دیکھتا تھا، ہوسکتا ہے۔ لیکن مجھ پر ان کا بھی اثر حقیقی توپوں اور گولیوں جیسا ہوتا تھا۔ دہشت سے میرے پنکھ مفلوج سے ہو جاتے تھے اور انتڑیاں منجمد ہو جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ میں گھونڈ کے بغیر اڑان بھرنے کو رضامند نہیں تھا۔ میں ایسے آدمی کے ہاتھوں پر سے کیوں اڑان بھروں جس کا رنگ بھورا نہ ہو اور جس کی آنکھیں نیلی ہوں۔ میں اس طرح کے لوگوں سے پہلے آشنا نہیں تھا۔ ہم کبوتر کسی بھی بدیشی سے، اور ہر ایک غیر ملکی سے مانوس نہیں ہو جاتے۔ آخر کار وہ مجھے پنجرے میں ڈال کر ہسپتال میں لے آئے جہاں گھونڈ تھا اور مجھے اُس کے برابر میں چھوڑ دیا گیا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو مشکل سے اُسے پہچان سکا۔ گھونڈ کی آنکھوں میں حقیقی خوف بسا تھا۔ وہ بھی ایک مرتبہ اس قدر دہشت زدہ ہوا تھا کہ حواس باختہ ہو گیا۔ میں جانتا ہوں جیسا کہ سبھی پرندے اور جانور جانتے ہیں، خوف کی شکل وصورت کیا ہوتی ہے۔ اور مجھے گھونڈ کے بارے میں بہت افسوس ہوا۔

لیکن مجھے دیکھ کر گھونڈ کی آنکھوں پر سے دہشت کا وہ جالا ہٹ گیا اور اُن میں مسرت کی روشنی چمک اٹھی۔ وہ اپنے بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے مجھے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور میرے اُس پاؤں کو چوم لیا جس میں اُس کا بھیجا ہوا پیغام باندھا گیا تھا۔ تب اُس نے میرے دائیں پنکھ پر تھپکی دی اور کہا ''اے خدائی پنکھوں والے کہکشاں! تو نے انتہائی درجہ کی مصیبت میں

بھی اپنے مالک کا اور اُس کے پیغام کا سر دوستوں میں بلند کر دیا ہے اور سبھی کبوتروں نیز ہندوستانی فوج کی عظمت بڑھا دی ہے۔'' اُس نے پھر سے میرے پاؤں کو بوسہ دیا۔ اُس کے انکسار نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور اپنی مثال سے مجھے بھی عجز وانکسار کا پیکر بنا دیا۔ مجھے تب فخر کا احساس نہیں رہا جب مجھے یاد آیا کہ جب دشمن کے جہاز نے میرے ایک پنکھ کو جزوی طور پر توڑ دیا تھا تو میں کیسے ہندوستانی بریگیڈ کی خندقوں میں جا گرا تھا۔ چونکہ اگر میں جرمنوں کی خندق میں گرتا تب کیا ہوتا۔ انہوں نے میری ٹانگ سے بندھا پیغام پکڑ لیا ہوتا۔ پھر انہوں نے اُس جنگل کو گھیر ڈالا ہوتا جہاں گھونڈ اُس جنگلی کتے کے ساتھ چھپا ہوا تھا —— یہ سوچ کر کہ پھر وہ کیا سلوک کرتے میرا بدن لرز اٹھتا ہے۔ افسوس! وہ کتا —— وہ ہمارا سچا دوست اور نجات دہندہ، نہ جانے اب وہ کہاں ہوگا۔''

نفرت اور خوف سے نجات

''اُس کتے کا ـــــ گھونٹ نے پھر سے اُس کی کہانی شروع کی۔ فرانسیسی مالک جنگ کے ابتدائی دنوں میں کھو گیا ہو گا۔ غالبًا! جرمنوں نے اُسے گولی کا نشانہ بنایا اور اُس کے بعد جب اُس نے اُنہیں اس کے مالک کے گھر کو لوٹتے اور اُس کے کھلیان کو آگ لگاتے دیکھا تو وہ خوف کے مارے پاگل ہو گیا۔ وہ جنگل میں بھاگ گیا جہاں وہ آدمیوں کی نظروں سے چھپ کر گھنی کانٹے دار جھاڑیوں کے نیچے رہنے لگا۔ یہ جگہ ایک جھونپڑے جتنی وسیع اور ایک مقبرے کے اندرونی حصے جیسی تاریک تھی۔ وہ شاید اپنی خوراک کی تلاش میں صرف رات کو باہر نکلتا تھا اور چونکہ وہ نسلاً شکاری کتا تھا جب اُسے دِن کے بعد دِن، رات کے بعد رات مسلسل ایک اشتہاری مجرم کی طرح جنگلوں میں گزارنی پڑی تو اُس کے سبھی وحشیانہ اوصاف اُس میں لوٹ آئے۔

جب اُس کی ملاقات مجھ سے ہوئی تو وہ حیران رہ گیا چونکہ میں اُس سے ڈرا نہیں۔ مجھ سے اُسے خوف کی بو نہیں آئی۔ کئی مہینوں میں میں پہلا ہی آدمی ہوں گا جس کے ڈر سے اُسے حملہ کرنے کی اکساہٹ نہیں ہوئی۔

بے شک اُس نے بھی یہی سوچا کہ میں بھی اُس کی طرح بھوکا ہوں اور خوراک ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اس لیے وہ مجھ جرمنوں کے رسد کے ذخیرے کی طرف لے گیا۔ اور ایک زیرِ

زمین راستے سے رینگ کر وہ رسد کے ایک بڑے گودام ـــــ جو گویا خوراک کی سونے کی کھان تھا ـــــ میں جا کر میرے لیے کچھ گوشت لے آیا۔ میں نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہاں بڑے بڑے کمروں کی ایک پوری لڑی ہو گی جن میں وہ نہ صرف اپنی خوراک رکھتے ہوں گے بلکہ گولہ بارود بھی رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے اُسی کے مطابق عمل کیا۔ دیوتاؤں کے فضل و کرم سے یہ صحیح ثابت ہوا تو لیجئے اب ہم موضوع بدلتے ہیں۔

میں تمہیں سچ بتاؤں کہ مجھے جنگ کا ذکر کرنے سے نفرت ہے۔ وہ دیکھو غروبِ آفتاب کی روشنی ہمالیہ کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ سونے کی کٹھالی کی طرح جگمگا رہی ہے۔ آؤ دعا کریں:-

مجھے غیر حقیقی سے حقیقت کی طرف لے چلو
اندھیرے سے روشنی کی طرف لے چلو
شور و غل سے سکوت کی طرف لے چلو

جب دھیان ختم ہو چکا تو گھونٹ چپکے سے ہمارے گھر سے نکل کر کلکتہ سے سنگالیلا کے بُدھ مٹھ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اِس سے قبل کہ میں وہاں کی اُس کی پُر خطر مہم کا حال بیان کروں میں آپ کو یہ ضرور بتا دوں کہ گھونٹ کو فرانس کے جنگی محاذوں سے ہمارے گھر پر کیسے منتقل کیا گیا۔

فروری 1915 کے آخری حصّے میں بنگال رجمنٹ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ رنگیلا اب دوبارہ نہیں اڑ سکے گا۔ گھونٹ جو اُسے لے کر آیا تھا خود کوئی سپاہی نہیں تھا۔ ایک آدھ شیر یا چیتے کے علاوہ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی اور کسی کو جان سے نہیں مارا تھا اور اب جبکہ وہ بھی بیمار تھا، ان دونوں کو جسمانی طور پر معذور قرار دے کر اکٹھے ہی ہندوستان واپس بھیج دیا گیا۔ وہ مارچ میں کلکتہ پہنچے۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ گھونٹ بھی اتنا ہی دہشت زدہ دکھائی دیا جتنا رنگیلا۔ وہ دونوں ہی بہت بیمار نظر آئے۔

گھونڈ نے میرا کبوتر مجھے سپرد کرنے کے بعد کچھ باتوں کی وضاحت کی، اس سے پہلے کہ وہ ہمالیہ کی جانب روانہ ہوا۔ ''میں خوف ونفرت سے نجات چاہتا ہوں۔ میں نے انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی ہلاکت بہت زیادہ دیکھ لی ہے۔ مجھے ناکارہ ٹھہرا کر گھر بھیج دیا گیا چونکہ میں مہلک بیماری کا مریض ہوں ـــــ خوف کے مرض کا۔ اب میں تنہا قدرت کی پناہ میں جاؤں گا اِس مرض سے شفا پانے کے لیے۔''

چنانچہ وہ سنگالیلا کے بدھ وہار میں چلا گیا جہاں پرارتھنا اور دھیان کے ذریعے اس کا علاج ہو سکے۔ اس اثنا میں میں نے رنگیلے کو تندرست کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُس کی بیوی اور بچے بھی جواب بڑے ہو چکے تھے، اس کی مدد نہیں کر پائے۔ اُس کے بچے اُسے محض ایک اجنبی سمجھتے تھے چونکہ اُس نے اُن میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن اُس کی بیوی میں اُس کو لے کر بے حد دلچسپی تھی لیکن وہ بھی اُسے اڑنے پر مائل نہیں کر سکی۔ وہ تھوڑا سا کودنے سے زیادہ کچھ کرنے سے برابر انکار کرتا رہا۔ اُسے ہوا میں اوپر اٹھنے کے لیے کوئی بات بھی آمادہ نہیں کر پائی۔ میں نے کبوتروں کے ڈاکٹروں سے اُس کے پنکھوں اور ٹانگوں کا معائنہ کروایا۔ انہوں نے یہی بات کہی کہ ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اُس کی ہڈیاں اور دونوں پنکھ چنگے بھلے ہیں۔ پھر بھی وہ اڑتا نہیں تھا۔ اپنا دایاں پنکھ تو کھولنے سے بھی وہ انکار کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ نہ دوڑ رہا ہو یا نہ پھُدک رہا ہو، اُسے ایک ہی پاؤں پر کھڑے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

مجھے اِس پر زیادہ تشویش نہ ہوتی اگر وہ اور اُس کی بیوی اپنا گھونسلا بنانا شروع نہ کرتے۔ اپریل مہینے کے وسط میں جب موسمِ گرما کی چھٹیاں ہوئیں تو مجھے گھونڈ کا خط ملا جس میں اُس نے مطلع کیا۔ ''ابھی تمہارے رنگیلا کو گھونسلا نہیں بنانا چاہئے اگر ان کے انڈے ہو جائیں تو انہیں ضائع کر دینا۔ انہیں ان انڈوں کو کسی بھی صورت میں سینے نہ دینا۔ رنگیلا جیسا بیمار باپ ـــــ جسے خوف کا مرض لاحق ہے ـــــ دنیا کو گھٹیا اور بیمار کبوتر بچے ہی دے گا۔ اُسے یہاں لے آؤ۔ خط کو بند کرنے سے پہلے یہ ضرور کہوں گا کہ اب میری حالت بہتر ہے۔ رنگیلے کو جلد یہاں

لانا۔ مقدس لاما تم سے اور اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ پانچوں ابابیلیں جنوب کے سفر سے اس ہفتے واپس پہنچ گئی ہیں۔ وہ ضرور تمہارے پالتو پرندے کے دل کی کیفیت میں تبدیلی لائیں گی۔''

میں نے گھونڈ کی نصیحت گانٹھ باندھ لی۔ رنگیلے کو ایک پنجرے میں ڈالا اور اُس کی بیوی کو دوسرے پنجرے میں، اور شمال کی جانب روانہ ہو گیا۔

گزشتہ خزاں کی نسبت اس موسمِ بہار میں پہاڑ کتنے مختلف سے لگے۔ نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر میرے ماں باپ نے دین تام والے مکان کو معمول سے کئی مہینے پہلے ہی کھول دیا۔ اپریل کے آخری ہفتے میں وہاں ڈیرہ جما کر میں نے رنگیلا کو اپنے ساتھ لیا اور اس کی بیوی کو وہاں پیچھے چھوڑ کر میں تبتیوں کے ایک خچر پر سوار قافلے کے ہمراہ سنگالیلا کو چل دیا تاکہ اگر وہ دوبارہ اڑنے کے قابل ہو گیا تو خود ہی اڑ کر اپنی بیوی کے پاس آ جائے گا۔ اُسے شفایاب کرنے کے لیے اِسی بات کی تو ضرورت تھی۔ اُس کی بیوی ہی اُس کی کشش کا باعث بن سکتی تھی۔ گھونڈ کو امید تھی کہ وہ واپس جا کر اپنی بیوی کو تازہ دیئے ہوئے انڈے سینے میں مدد دینے کے لیے ایسا کر بھی سکتا تھا حالانکہ ہماری روانگی سے اگلے ہی دن میرے والدین نے وہ انڈے ضائع کر دیئے تھے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ بیمار اور نالائق بچے پیدا ہو کر رنگیلا کے نام کو بٹہ لگائیں۔

میں نے اپنے پرندے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھا جہاں وہ دن بھر ٹکا رہتا۔ رات کو ہم اُسے حفاظت سے اُس کے پنجرے میں بند رکھتے۔ یہ اُس کے لیے مفید ثابت ہوا۔ بارہ گھنٹوں میں پہاڑ کی ہوا اور روشنی نے اُس کے جسم میں کافی سُدھار آیا۔ پھر بھی اُس نے ایک بار بھی میرے کندھے سے اڑنے کی کوشش نہیں کی تاکہ وہ اپنی بیوی کے پاس جا کر انڈے سینے میں اُس کی مدد کر سکے۔

ہمالیہ کا حسن موسمِ بہار میں لامثال ہوتا ہے۔ زمین سفید رنگ کے بنفشہ کے پھولوں سے جگمگا رہی تھی جن کے بیچ بیچ رس بھری کے پودوں پر پھل تھے جو گرم مرطوب درّوں میں جہاں

تہاں پہلے سے پک رہے تھے، وہیں ہنس راج کے پودے اپنی لمبی بانہیں پسارے گویا ان سفید دودھیا پہاڑیوں کو اپنی آغوش میں بھر لینا چاہتے تھے۔ جو آسمان کے گلے میں بیش قیمت نگینوں کی طرح آویزاں تھیں۔ کبھی کبھی ہم گھنے جنگلوں سے گزرے جہاں ٹھگنے قد کے شاہ بلوط، عظیم الشان ایلم، دیودار اور اخروٹ کے درخت اتنی کثرت سے اگے ہوئے تھے کہ ان کی شاخوں سے سورج کی روشنی زمین پر ٹھیک سے پہنچ بھی نہیں پاتی تھی۔ درخت کے برابر درخت، ٹہنی کے ساتھ ٹہنی اور جڑوں سے جڑی ہوئی جڑیں سورج کی روشنی اور زندگی پانے کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ان درختوں کے نیچے اندھیرے میں بہت سے ہرن کثرت سے اگنے والی لمبی گھاس اور پودوں کو چرتے رہتی تھی۔ اور بعد میں ان کا انجام تھا محض شیروں، چیتوں اور لکڑ بگھوں کا نوالہ بننا۔ وہاں زندگی ہر طرف بکثرت فروغ پا رہی تھی اور زندگی کے لیے پرندوں، حیوانات اور پودوں کی جدوجہد کو مزید شدید کر رہی تھی۔ حیات کی بقائی فطرت ہی کچھ ایسی برخود غلط ہے۔ یہاں تک کہ کیڑے بھی اِس سے مبرّا نہیں۔

جب ہم جنگلوں کے اندھیرے سے باہر نکلے اور کھلی جگہوں کو دیکھا تو سورج کی گرم تپتی روشنی نے یکا یک ہماری بے بس آنکھوں کو اپنے آتشیں تیروں کا نشانہ بنایا۔ سون مکھیوں کی سنہری لرزش ہوا میں بھر رہی تھی۔ تتلیاں، چڑیاں، سرخ چھاتی والی چڑیاں، جنگلی مرغ، پپیہے، نیل کنٹھ اور مور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر، اور ایک چوٹی سے پھر اُس سے اونچی چوٹی پر شور وغل مچاتے اور پیار کی پینگیں بڑھاتے پھرتے تھے۔

اب کھلے علاقے میں جہاں سڑک کے ایک جانب چائے کے باغان تھے اور ہمارے دائیں طرف چیڑ کے جنگلات، ہم نے لگ بھگ چاقو کی دھار کی طرح سیدھی ڈھلانوں پر ڈگمگاتے ہوئے بڑی پُر مشقت چڑھائی کی۔ وہاں ہوا اس قدر ہلکی تھی کہ سانس لینا ہمیں مشکل ہوگیا۔ ہماری آوازیں اور اُن کی گونج دُور دُور تک پہنچتی تھیں۔ ایک معمولی سرگوشی بھی گزوں دور تک صاف سنائی دے جاتی تھی۔ آدمی اور جانور سبھی خاموش ہوگئے۔ یہاں سوائے ان خچروں

کے سُموں کی کھٹ کھٹ کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ایسی تنہائی اور سکوت کے تئیں ایک تعظیم کا احساس اپنے آپ ابھرتا تھا۔ اِسی احساس نے ہمارے منہ بند کر دیئے تھے۔ یہاں آسمان کا رنگ گہرا نیلگوں تھا۔ کہیں بادلوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ سوائے سارسوں کی گاہے بگاہے پرواز کی سرسراہٹ کے، جو شمال کی سمت میں جا رہے ہوتے تھے یا کسی عقاب کے کبھی کبھی قریبی نشیب میں غوطہ لگاتے وقت کی کرخت آواز کے—— یہاں ہر شے سرد تھی، نکیلی تھی اور تیز رفتار۔ آرکِڈ کے پھول راتوں رات کھلتے اور اپنی ارغوانی آنکھیں کھول کر ہمیں لبھاتے۔ گیندے کے پھول صبح کی شبنم سے لبریز ہوتے تھے اور نیچے جھیل میں سفید کنول اپنی پتیاں مکھیوں کے خیر مقدم کے لیے کھول دیتے تھے۔

اب ہم سنگالیلا کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ بُدھ وہار سر اٹھائے پہاڑ کے دامن سے ہمیں اشارہ کر رہا تھا۔ پنکھ کی شکل کی اُس کی چھت اور قدیم دیواریں اُفق کے مقابل ایک جھنڈی کی طرح تیرتی نظر آتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی رفتار تیز کرنے کی تحریک ہوئی۔ مزید ایک گھنٹے میں میں اُس وہار تک پہنچنے والی سیدھی ڈھلواں پگڈنڈی پر جا چڑھا۔

کتنی راحت ملی وہاں اُن لوگوں کے درمیان جا کر جو ہماری روزمرّہ کی زندگی کی لڑائی سے بالاتر ہو کر رہتے ہیں۔ چونکہ اس وقت دوپہر تھی میں گھونڈ کے ساتھ نیچے گل مہندی کے جنگل میں چلا گیا۔ وہاں چشمے پر ہم نہائے اور رنگیلا کو بھی اچھی طرح غسل کرایا۔ جب ہمارا پرندہ پنجرے میں اپنا کھانا کھا چکا تو گھونڈ اور میں کھانے کے ہال کمرے میں پہنچے جہاں بھکشو (لاما) ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کمرہ آبنوس کے کھمبوں کا مجموعہ نظر آتا تھا ان کھمبوں کے سرِ ڈنڈوں کی آرائش سونے کے اجگروں سے کی گئی تھی۔ ساگوان کی لکڑی کی کڑیاں (بالے) کئی صدیوں کی عمر کے باعث کالی پڑ چکی تھیں۔ اور ان پر کنول پھول کے نقش کاڑھے ہوئے تھے جو یاسمین جیسے نازک لگتے تھے لیکن دھات کی طرح سخت تھے۔ سرخ ریتیلے پتھر کے فرش پر نارنجی چغے پہنے لاما لوگ خاموشی سے بیٹھے پرارتھنا کر رہے تھے جو ہر کھانے سے پہلے ان کی معمول کی مختصر دعا تھی۔ کھانے کے ہال کے

دروازے پر گھونڈ نے اور میں نے تب تک انتظار کیا جب تک ان کی پرارتھنا ختم نہیں ہوئی۔ یہ اس دُعا کے ساتھ پوری ہوئی۔

بُدھم می شرنم
دھرمم می شرنم
اوم منی پدمے اوم
(مفہوم) گیان (عرفان) میں ہم بُدھ کی پناہ میں ہیں
ہم دھرم (ایمان) کی پناہ میں ہیں
ہم ستیہ کے رتن کی پناہ میں ہیں (جو زندگی کے کنول میں جگمگاتا ہے)

اب میں نے آگے بڑھ کر اُس وہار کے صدر لاما کو پرنام کیا جس کے سنجیدہ چہرے پر اُس وقت مسکراہٹ سے جھریاں اُبھر آئیں، جب اُس نے مجھے آشیرباد دیا۔ جب میں باقی سب لاماؤں کو پرنام کر چکا تو گھونڈ اور میں نے کھانے کی میز کے پاس اپنی نشست سنبھال لی۔ یہ میز لکڑی کے اسٹولوں کی ایک لمبی لڑی سے بنی ہوئی تھی۔ جب ہم فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے تو یہ میز ہماری چھاتی کے برابر آ رہی تھی۔ بہت ہی گرم دن کے سفر کے بعد ٹھنڈے فرش پر بیٹھنا بہت سُہانا لگا۔ ہمارے کھانے میں مسور کی دال، تلے ہوئے آلوؤں اور بینگن کی سبزی تھی۔ چونکہ میں اور گھونڈ شاکاہاری تھے ہم نے انڈے نہیں کھائے جو کھانے کی میز پر پیش کئے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے گرم گرم چائے پی۔

کھانے کے بعد صدر لاما نے گھونڈ کو اور مجھے قیلولہ کرنے کے لیے مدعو کیا۔ ہم اُس کے ساتھ سب سے اونچی چوٹی تک چڑھے جو کسی عقاب کے گھونسلے کی طرح تھی۔ اُس کے اوپر صنوبر کے درختوں کا ایک جھنڈ اُگا ہوا تھا۔ وہاں ہم نے ایک کھلی اور سادہ کوٹھری دیکھی جس میں کہیں بھی فرنیچر کے نام پر ایک چھڑی تک نہیں تھی۔ ایسا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب ہم وہاں بیٹھ گئے تو مقدس انسان نے بتایا "یہاں وہار میں ہم نے ذاتِ رحیم سے ہر روز دو مرتبہ اس کرّہ

زمین پر امن کے لیے پرارتھنا کی ہے۔ پھر بھی جنگ جاری ہے جو پرندے اور حیوانات تک کو خوف اور نفرت کے روگ لگا رہی ہے۔ باطنی بیماریاں جسمانی امراض کے بمقابلہ زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ انسانیت پر خوف، نفرت، شک اور بغض کا بوجھ اس قدر بڑھنے والا ہے کہ انسانوں کو ان سے مکمل رہائی کے لیے ایک پوری نسل چاہیے۔

صدر لاما کی پیشانی جس پر پہلے کوئی بل دکھائی نہیں دیتا تھا، بے انتہا اُداسی کی لکیریں اُبھر آئیں اور اُس کے منہ گہری تھکان سے سکڑ گئے۔ اگرچہ وہ اس لڑائی سے الگ اپنے عقابی گھونسلے میں رہتا تھا لیکن وہ انسانوں کے گناہوں کے بوجھ کو ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ شدید دُکھ سے محسوس کر رہا تھا جنہوں نے دنیا کو جنگ میں دھکیل دیا تھا۔

لیکن اس نے مسکرا کر گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ اب رنگیلا کی اور گھونڈ کی بات کریں جو اس وقت ہمارے پاس ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا کبوتر پھر سے آسمان کی گہرائی کو اپنے پنکھوں تلے لائے تو تمہیں بے حد حوصلہ سے کام لینا چاہیے جیسا کہ گھونڈ پچھلے کافی دنوں سے کر رہا ہے۔"

"وہ کس طرح میرے سوامی؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ صدر لاما کا چہرہ سرخی سے بھر گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میرے براہِ راست سوال سے قدرے پریشان ہوا اور میں نے بھی شرمندگی محسوس کی۔ صاف گوئی بھی جلد بازی کی طرح اوچھا پن بن جاتی ہے۔

صدر لاما جیسے میرے احساس کو سمجھ گیا۔ میری تسلی کے لیے بولا "ہر صبح اور ہر شام غروب آفتاب کے وقت رنگیلے کو اپنے کاندھے پر بٹھا لیا کرو اور اپنے آپ سے کہا کرو 'لازوال ہمت سبھی جانداروں میں ہے۔ ہر جاندار جو زندہ ہے اور سانس لیتا ہے لاانتہا حوصلے کا ذخیرہ ہے۔ ہے۔ ایشور (اے خدا) مجھے اس قدر پاکیزگی دے کہ میں جن کو چھوؤں اُن میں لازوال حوصلہ بھر دوں۔' اگر کچھ دیر کے لیے تم ایسا کرو گے تو ایک دن تمہارا دل ذہن اور روح پورے طور پر پاک ہو جائیں گے۔ اُس لمحہ تمہاری روح جو اُس وقت خوف، نفرت اور شبہ سے آزاد ہو چکی ہوگی۔ اُس

کی شکتی کبوتر میں سما کر اُسے بھی ان سے آزاد کر دے گی۔ جو اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ حد تک شُدھ کر لیتا ہے، دنیا کو عظیم ترین روحانی طاقت سے معمور کر سکتا ہے۔ میں نے جو نصیحت کی ہے اُس پر دِن میں دو بار عمل کرو۔ ہمارے سبھی لاما تمہاری مدد کریں گے۔ آؤ دیکھیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

ایک لحظہ کی خاموشی کے بعد لاما نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "گھونڈ نے جو جانوروں کے بارے میں کسی بھی دوسرے آدمی سے زیادہ علم رکھتا ہے، تم کو بتا دیا ہے کہ ہمارا خوف ہی دوسروں کو خوف زدہ کرتا ہے تبھی وہ ہم پر حملہ کرتے ہیں۔ تمہارا کبوتر اس قدر خوف زدہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے جیسے پورا آسمان اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ کوئی پتہ بھی گرتا ہے تو وہ اُس سے بھی ڈر جاتا ہے۔ کوئی سایہ بھی پڑتا ہے تو اُس کی روح میں دہشت بھر دیتا ہے لیکن اُس کے دُکھ کا کارن وہ خود ہی بنا ہوا ہے۔

"عین اسی وقت یہ گاؤں جو ہمارے نیچے ہے —— ہاں جسے تم سامنے شمال مغرب میں دیکھ سکتے ہو، اُسی دُکھ کا مریض ہے جس میں رنگیلا مبتلا ہے۔ چونکہ آج کل جانوروں کے شمال میں آنے کا وقت ہے اس گاؤں کے سبھی باشندے ان جنگلی جانوروں کو ہلاک کرنے کے لیے پرانی توڑے دار بندوقیں لیے پھرتے ہیں۔ اور دیکھو اب وہ جنگلی جانور بھی ان پر حملہ کرتے ہیں حالانکہ پہلے وہ کبھی ایسا نہیں کرتے تھے۔ جنگلی بھینسے آتے ہیں اور اُن کی فصلوں کو کھاتے ہیں۔ لکڑ بگھے اُن کی بکریاں چُرا لے جاتے ہیں۔ آج یہاں یہ خبر ملی کہ ایک جنگلی بھینسے نے کل رات ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ اگرچہ میں اُن سے کہتا ہوں کہ وہ پرارتھنا اور دھیان کے ذریعہ اپنے دل سے خوف کو نکال پھینکیں، وہ ایسا نہیں کرتے۔"

"اے صاحبِ برکات گرو ایسا کیوں؟" گھونڈ نے دریافت کیا۔ "کیا آپ مجھے اجازت نہیں دیں گے کہ میں وہاں جا کر انہیں ان جنگلی جانوروں سے نجات دلاؤں؟"

"ابھی نہیں" لاما نے جواب دیا "تم اگرچہ اپنی بیداری کے اوقات میں خوف سے

آزاد رہتے ہو لیکن تمہارے خواب اب بھی خوف کی لعنت کو دعوت دیتے ہیں۔ آؤ مزید کچھ روز ہم پرارتھنا اور دھیان کریں۔ تب تمہاری روح سے ایسی آلودگی خارج ہو جائے گی۔ تب تمہارے پوری طرح شفایاب ہو جانے کے بعد اگر نیچے کے گاؤں کے لوگوں کو تب تک جنگلی جانور ستاتے ہوں گے تو تم وہاں جا کر اُن کی مدد کرنا۔"

لاما کی حکمت

صدر لاما کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کئے گئے پُرمشقت دھیان کے تقریباً دسویں دن صدر لاما نے رنگیلا کو اور مجھے بُلا بھیجا۔ چنانچہ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ کبوتر کو تھامے ہوئے میں چڑھائی چڑھ کر اُس کے حجرے میں پہنچا۔ لاما کا چہرہ جو عموماً زرد رہتا تھا آج بھورا اور پُرجلال دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی بادام نما آنکھوں میں ایک انوکھا توازن اور شکتی تھی۔ اُس نے رنگیلا کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بولا:

ایشور کرے شمالی ہوا تمہیں شفا بخشے

جنوب کی ہوا تمہیں شفا بخشے

مشرق اور مغرب کی ہوائیں تمہیں شفا بخشیں

خوف تم سے دور بھاگ جائے

نفرت تم سے دور بھاگ جائے

اور شک تمہیں چھوڑ بھاگے

امڑتے ہوئے سیلاب کی طرح ہمت تمہارے بدن میں دوڑ جائے

تمہارے سارے وجود پر سکون طاری ہو

استقلال اور قوت تمہارے دو پنکھ بن جائیں

تمہاری آنکھوں میں ہمت جگمگائے

توانائی اور شجاعت تمہارے دل میں سمائے

تم شفایاب ہو

تم شفایاب ہو

تم شفایاب ہو ــــــ شانتی ــــــ شانتی ــــــ شانتی۔

انہی خیالات پر دھیان مرکوز کئے ہوئے ہم مراقبہ میں غروبِ آفتاب کے وقت تک بیٹھے رہے۔ جب ہمالیہ کی چوٹیاں شفق کے رنگ برنگے شعلوں کی زد میں آگئیں۔ ہمارے گرد و پیش کی وادیوں، خلاؤں اور جنگلوں نے ارغوانی شوکت کا چغہ پہن لیا۔

رنگیلا آہستہ سے صدر لاما کے ہاتھوں سے نیچے کودا۔ چلتا ہوا حجرے کے دروازے تک گیا اور اُس نے غروبِ آفتاب کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنا بایاں پنکھ پھیلایا اور کچھ پل انتظار کیا۔ تب ہلکے ہلکے اور بہت ہی آہستہ آہستہ اُس نے دایاں پنکھ پھیلا، ایک ایک پر، ایک ایک نس ــــ یہاں تک کہ آخر کار یہ بادبان کی طرح پھیل گیا۔ بجائے کوئی ڈرامائی حرکت کرنے کے ــــ مثلاً فوراً اڑ جانا ــــ اُس نے احتیاط سے اپنے دونوں پنکھ سمیٹ لیے جیسے کہ وہ دو بیش قیمت لیکن حد درجہ نازک پنکھے ہوں۔ وہ بھی غروبِ آفتاب کو پرنام کرنا جانتا تھا۔ ایک پجاری کے سے وقار کے ساتھ وہ زینے سے نیچے اترا۔ لیکن ابھی وہ مشکل سے نظر سے اوجھل ہوا تھا کہ میں نے تصور میں اُس کے پنکھوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ میں بہت جلدی میں اُٹھنے ہی والا تھا تاکہ دیکھوں کہ اصل میں کیا ہوا ہے لیکن مقدس لاما نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک دیا۔ اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اگلی صبح میں نے، جو کچھ ہوا تھا، گھونڈ کو بتایا۔ اُس نے خوشی سے جواب دیا "تم کہتے ہو کہ رنگیلا نے غروبِ آفتاب کو پرنام کرنے کے لیے اپنے پنکھ پھیلائے۔ اس میں تعجب کی بات

نہیں۔ جانور دھارمک (اہلِ ایمان) ہوتے ہیں حالانکہ انسان اپنی لاعلمی میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایسے نہیں ہوتے۔ میں نے بندروں، عقابوں، کبوتروں، تیندوؤں اور یہاں تک کہ نیولوں کو بھی طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کو پرنام کرتے دیکھا ہے۔

''کیا آپ یہ مجھے بھی دکھا سکتے ہیں؟''

گھونڈ نے جواب دیا ''جی ہاں۔ لیکن ابھی نہیں۔ آؤ چلو اور رنگیلا کو اُس کا ناشتہ کھلائیں۔''

جب ہم اُس کے پنجرے کے پاس پہنچے تو اُس کا دروازہ کھلا ہوا پایا۔ کبوتر اُس میں نہیں تھا۔ مجھے حیرانی نہیں ہوئی چونکہ میں اُس راہب کے گھر کے قیام کے دوران رات کو پنجرہ غیر مقفل چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن وہ کہاں گیا ہوگا؟ صدر عمارت میں وہ ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ تب ہم لائبریری میں گئے۔ وہاں ایک سنسان بیرونی کوٹھری میں ہمیں اُس کے کچھ پر ملے اور وہاں نزدیک ہی گھونڈ نے ایک نیولے کے پاؤں کے نشان کھوج کر بتائے۔ تب ہمیں شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن اگر نیولے نے اُسے حملہ کر کے مار ڈالا ہوتا تو وہاں فرش پر خون بھی ہوتا۔ تب وہ کدھر اڑ گیا ہوگا؟ اُس نے کیا کیا؟ —— اب وہ کہاں ہوگا۔ ہم گھنٹہ بھر اُس کی کھوج میں پھرتے رہے۔ عین جس لمحہ ہم نے اُس کی تلاش چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہم نے اُس کی کوکو کی آواز سُنی۔ اور لو وہ وہیں لائبریری کی چھت پر تھا اور اپنی پرانی دوست ابابیلوں سے بات چیت کر رہا تھا جو وہاں اولتی میں اپنے گھونسلوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ اُس کی کوکو کا جواب جو وہ دے رہی تھیں ہم اس کا مطلب سمجھ رہے تھے۔ میاں ابابیل کہہ رہا تھا ''چیپ چیپ چیپ'' میں نے خوش ہو کر رنگیلے کو پکارا اور اُسے ناشتہ کے لیے آواز دی ''آیا آقا'' اُس نے اپنی گردن موڑی اور غور سے سُنا۔ تب جب میں نے دوبارہ اُسے آواز دی تو اُس نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً اونچی آواز سے اپنے پنکھ پھڑپھڑائے۔ تب وہ اڑ کر میری کلائی پر آ بیٹھا۔ وہ اتنا شانت تھا جتنا کہ کھیرا۔ صبح کو بہت سویرے اُس نے لاماؤں کے قدموں کی آواز سنی ہوگی جو صبح کے مراقبے کے لیے اوپر جا رہے ہوں گے۔ وہ اپنے پنجرے سے نکل کھڑا

ہوا۔ تب ٹہلتا ٹہلتا وہ کہیں بیرونی کوٹھری تک گیا جہاں بلاشبہ ایک نوجوان اور ناتجربہ کار نیولے نے اُس پر حملہ کر دیا۔ رنگیلا جیسے تجربہ کار نے محض اپنے چند بال و پر پیش کر کے اُسے آسانی سے چکمہ دیا اور جبکہ وہ لونڈا اینڈا اُن بہت سے اکھڑے ہوئے پروں کے اندر والے کبوتر کا متلاشی تھا، اُسے ملنے والا شکار آسمان میں اڑ گیا۔ وہاں اُس کی ملاقات اُس کے پرانے دوست میاں ابابیل سے ہو گئی جو طلوع ہوتے ہوئے سورج کو پرنام کرنے کے لیے اڑ رہا تھا۔ اور جب وہ دونوں مل کر صبح کی پوجا کر چکے تو وہ دوستانہ گپ شپ کے لیے لائبریری کی چھت پر آ گئے۔

اُس روز مٹھ میں ایک بڑی خوفناک خبر پہنچی۔ صدر لاما نے ایک روز پہلے جس گاؤں کا ذکر کیا تھا اُس پر ایک جنگلی بھینسے نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ گزشتہ شام گاؤں میں آیا اور اُس نے دو آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا جو گاؤں کے اناج کوٹنے کے مقام پر منعقد کی گئی گاؤں کے بڑوں کی ایک بیٹھک میں شمولیت کے بعد گھر واپس جا رہے تھے۔ گاؤں والوں نے صدر لاما کے پاس ایک وفد اس درخواست کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ اُس جنگلی جانور کی ہلاکت کے لیے دعا کرے اور اُس وحشی جانور کی روح میں جو بھوت سمایا ہوا ہے، اُسے جھاڑ پھونک کے ذریعے اتار دے۔ مقدس لاما نے کہا کہ وہ ایسے ذرائع استعمال کرے گا جن سے چوبیس گھنٹوں کے اندر اس قاتل بھینسے کی موت ہو جائے گی۔

''اے لازوال ذاتِ رحمانی کے پیارو! شانتی سے گھر واپس جاؤ۔ تمہاری دعاؤں کا ثمر ملے گا۔ رات ہونے کے بعد گھر سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہ لینا۔ گھر پر رہ کر شانتی اور حوصلہ پر دھیان لگانا۔'' گھونڈ نے جو اس موقعہ پر موجود تھا، دریافت کیا ''یہ بھینسا کتنے عرصے سے تمہارے گاؤں کو پریشان کر رہا ہے؟'' پورے وفد نے تصدیق کی کہ ایک ہفتے سے وہ ہر رات آ رہا ہے۔ وہ ان کی ربیع کی لگ بھگ آدھی فصل کھا چکا ہے۔ مؤثر اور کارگر جھاڑ پھونک اور بھوت اتارنے کے عمل کے لیے دوبارہ گزارش کر کے وہ لوگ واپس اپنے گاؤں چلے گئے۔

وفد کے چلے جانے کے بعد لاما نے نزدیک کھڑے گھونڈ سے کہا: ''اے فتح مندی کے

لیے منتخب انسان! اب جب کہ تم شفایاب ہو چکے ہو، آگے بڑھو اور اُس قاتل کو ہلاک کرو۔"

"لیکن میرے سوامی"

"اب ڈرو مت گھونڈؔ! تمہارے مراقبوں نے تمہیں شفا بخش دی ہے، اس وسیلے سے جو تمہاری حصولیابی ہے، اب جنگلوں میں جا کر اس کی آزمائش کرو۔ تنہائی میں انسان جو طاقت اور شجاعت حاصل کرتے ہیں انہیں اس کی آزمائش بھیڑ میں جا کر کرنی چاہیئے۔ اب سے سورج کے دوبارہ غروب ہونے سے پہلے ہی تم فتح یاب ہو کر لوٹو گے۔ مجھے تمہاری کامیابی کا مکمل یقین ہے اور اس کی تصدیق کے طور پر میری گزارش ہے کہ تم اِس لڑکے کو اور اس کے کبوتر کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ یقین مانو میں ایک سولہ سال کے لڑکے کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے میں تمہیں ہرگز نہ کہتا اگر مجھے تمہاری جواں مردی پر یا تمہاری مہم کی کامیابی پر ذرا بھی شک ہوتا۔ جاؤ اور قاتل کا محاسبہ کرو۔

اُسی دن بعد دوپہر ہم جنگل کو چل دیئے۔ مجھے ایک بار پھر کم از کم ایک رات اور وہاں گزارنے کے امکان پر بے حد خوشی ہوئی۔ گھونڈؔ اور کبوتر کے ہمراہ ایک جنگلی بھینسے کی تلاش میں جانا کلّی طور پر ایک بار پھر میرے لیے کتنی مسرت کا مقام تھا۔ کیا روئے زمین پر کوئی ایسا لڑکا ہے جو ایسے موقعے کا خیر مقدم نہیں کرے گا؟

چنانچہ ہم رسّی کے زینے، ایک کمند اور تیز دھار والے ہتھیاروں سے مسلّح ہو کر روانہ ہو گئے۔ رنگیلا میرے کندھے پر سوار تھا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے عام لوگوں کے بارودی ہتھیار استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے، اس لیے ہم رائفلیں ساتھ نہیں لے گئے۔

تین بجے کے بعد ہم اُس بودھ مٹھ کے شمال مغرب میں واقع اُس گاؤں میں پہنچے۔ وہاں سے ہم نے بھینسے کے پاؤں کے نشانوں پر چلنا شروع کیا، اور اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھنے جنگل سے گزر کر وسیع اور صاف کئے ہوئے علاقوں سے بھی گزرے۔ کہیں کہیں ہم نے ندی پار کی اور کہیں کہیں گرے ہوئے بڑے بڑے پیڑوں کے اوپر سے بھی گزرنا پڑا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کہ بھینسے کے سُموں کے نشان بہت واضح اور گہرے تھے۔

گھونڈؔ نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا" اُس بھینسے کو موت کے خوف کا احساس ہوا ہوگا۔ یہ دیکھو کہ کتنے زور سے وہ یہاں پاؤں مار کر بھاگا ہے۔ جانور جب نڈر گھومتے ہیں تو اپنے پیچھے بہت کم پاؤں کے نشان چھوڑتے ہیں۔ لیکن جب ڈرے ہوئے ہوتے ہیں تو مارے جانے کے خوف سے اُن کا جسم بوجھل ہو کر زمین کو مسلتا ہے۔ اِس بھینسے کے سُموں نے بہت نمایاں اور صاف نشان چھوڑے ہیں، جہاں جہاں سے بھی وہ گزرا ہے۔ وہ کس قدر دہشت زدہ ہوگا بھلا؟"

آخر کار ہم ایک ناقابلِ عبور دریا تک پہنچ گئے۔ گھونڈؔ کی رائے میں اس دریا کی رواتنی تیز تھی کہ اگر ہم اس میں قدم رکھتے تو ہماری ٹانگیں توڑ دیتی۔ یہ بھی خاصی تعجب کی بات تھی کہ بھینسے کو بھی اسے عبور کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اس لیے ہم نے بھی اُسی کی مثال کی تقلید کی اور دریا کے کنارے کنارے مزید سُموں کے نشان کھوجنے لگے۔ مزید بیس منٹوں میں ہم نے دیکھا کہ وہ ندی کنارے سے ہٹ کر ایک گھنے جنگل میں گُم ہو گئے جو کسی غار کی طرح تاریک لگتا تھا حالانکہ ابھی شام کے پانچ ہی بجے تھے۔ یہ مقام کسی بھی عمر کے بھینسے کے لیے اُس گاؤں سے آدھے گھنٹے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

گھونڈؔ نے پوچھا" دریا کا سنگیت سُن رہے ہو کیا؟" کچھ منٹوں تک غور سے سُنا تو ایسا لگا کہ قریب ہی پانی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ کنارے کے پودوں اور گھاس کو چوم رہا تھا۔ یہ دریا بہہ کر جس جھیل میں جا رہا تھا اُس سے ہم کوئی بیس فُٹ کے فاصلے پر تھے۔ تب گھونڈؔ نے پکار کر کہا۔ قاتل بھینسا یہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ اِس جگہ اور جھیل کے درمیان غالبًا کہیں سویا ہے۔ آؤ اُدھر اُن جڑواں پیڑوں میں سے ایک پر اپنا ٹھکانہ بنالیں۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی یہاں آئے گا۔ جب وہ آئے تو اُس وقت ہمیں جنگل میں زمین پر نہیں ہونا چاہیئے۔ دونوں درختوں کے درمیان مشکل سے چار فٹ کا فاصلہ تھا۔

اُس کے آخری الفاظ مجھے تشویش بھرے لگے۔ اس لیے میں نے پیڑوں کے بیچ کی خالی جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ پیڑ اونچے اور گھنے تھے اور دونوں کے درمیان دھرتی کا ایک ٹکڑا تھا، بس اتنا

چوڑا کہ جس میں ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے کھڑے ہوسکیں۔

''اب میں ان جڑواں پیڑوں پر اپنا کُرتا ڈال دُوں گا۔تب گھونٹو نے اپنے کُرتے کے نیچے سے پرانے کپڑوں کی ایک گٹھری نکالی جواب تک وہ پہنتا رہا تھا، اُسے اُس نے زمین پر رکھ دیا اور پھر اُن پیڑوں میں سے ایک پر چڑھ گیا۔ جب وہ اوپر جا چکا تو اُس نے رسّی والا زینہ میرے لیے نیچے لٹکایا۔ میں رنگیلے کے ہمراہ اوپر چڑھنے لگا۔ رنگیلا اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتا اور میرے کندھے سے ٹکراتا رہا۔ ہم دونوں سلامتی سے اُس ٹہنی پر پہنچ گئے جہاں گھونٹو بیٹھا تھا۔ چونکہ شام تیزی سے گہری ہو رہی تھی ہم کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔

دن ڈھلتے وقت سب سے پہلی چیز جو میں نے دیکھی وہ تھی پرندوں کی زندگی۔ بگلے، فاختائیں، جنگلی مرغ، تیتر، چڑیاں اور طوطوں کے زمرد رنگے جھنڈ اپنے شوروغل سے جنگل کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، کٹ پھوڑے (ہدہد) کی کٹکٹاہٹ، اور آسمان میں بہت اونچائی پر عقابوں کی کرخت پکار اور اس میں مخلوط پہاڑی دریا کا تیز اور کان پھاڑنے والا شور، نیز پہلے سے جاگے ہوئے لکڑ بگھوں کی ہنسی کا الگ الگ بدلتا لہجہ سب اس میں شامل تھے۔

جس درخت پر ہم نے رات کے لیے اپنا ڈیرہ جمایا تھا وہ بہت اونچا تھا۔ ہم اس بات کا اطمینان کرنے کے لیے تھوڑا اور اوپر تک گئے کہ ہم سے اوپر بیٹھا ہوا کوئی تیندوا یا سانپ تو نہیں۔ بغور معائنے کے بعد ہم نے دو ٹہنیاں چن لیں جن کے بیچ میں ہم نے لہناری والا زینہ ایک مضبوط جہازی پلنگ کی طرح لٹکا دیا۔ ہم نے اپنے آپ کو اپنی نشست پر محفوظ کر لیا تو گھونٹو نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے فوراً اوپر دیکھا وہاں ایک یاقوتی پنکھوں والا بڑا سا عقاب منڈلا رہا تھا۔ اگرچہ جنگل کی زمین سے اندھیرا ایک سیلاب کی طرح امڈ رہا تھا۔ اوپر کے خلاؤں سے آسمان کسی کبوتر کی گردن کی طرح سُرخ دکھائی دے رہا تھا اور اس میں وہ اکیلا عقاب بار بار چکر کاٹتا نظر آ رہا تھا جو گھونٹو کی رائے میں غروب ہوتے سورج کی پوجا کر رہا تھا۔ اُس کی موجودگی نے پہلے ہی جنگل کے پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں پر خاموشی کا طلسم طاری کر دیا تھا، حالانکہ وہ ان سے بہت اونچائی پر

تھا پھر بھی خاموش عابدوں کی طرح انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جبکہ اُن کا بادشاہ عقاب کبھی پیچھے کبھی آگے چکر پر چکر کاٹ رہا تھا۔ اور اپنے دیوتا، روشنیوں کے پرم پتا کی پری کرما کھیا پجاری کی طرح وجد میں آ کر کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ (شفق کی) یاقوتی آگ اُس کے پنکھوں سے معدوم ہو رہی تھی۔ اب یہ پنکھ سنہری چنگاریوں سے جڑے جامنی رنگ کے بادبان بنے ہوئے تھے۔ اب یوں لگا کہ اس کی پرستش مکمل ہو چکی تھی۔ وہ آسمان میں اور اونچا اٹھ کر اور اپنے دیوتا کے آگے خود سپردگی کے طور پر سُرخ اونچی چوٹیوں کی جانب اڑ گیا۔ جہاں گویا آگ لگی ہوئی تھی اور اُن چوٹیوں کے پُر جلال روشنی میں ایک پتنگے کی طرح غائب ہو گیا۔

نیچے ایک بھینسے کی ہنکار نے کیڑوں مکوڑوں کی آوازوں کے قفل ایک ایک کر کے کھول دیئے اور شام کے سناٹے کی دھجیاں اڑا دیں۔ قریب ہی ایک الّو بول پڑا جس کے باعث رنگیلا میرے کرتے میں اور بھی سکڑ کر میرے کلیجے سے لپٹ گیا۔ یکایک ایک ہمالیائی ڈوکل نے (جو رات کا پرندہ ہے اور بلبل سے مشابہہ ہے) اپنا جادوئی نغمہ بکھیر دیا جیسے کوئی دیوتا چاندی کی بانسری بجا رہا ہو۔ اُس نے تان پر تان اور دُھن پر دُھن چھیڑ کر شانتی کی ایک باڑھ سی بہا دی جو بارش کی طرح پیڑوں کے تنے سے ہوتی ہوئی ان کھردری چھالوں پر ٹپکی اور پھر جنگل کی زمین کے کلیجے میں سما گئی۔

ہمالیہ میں موسمِ گرما کے آغاز کی رات کا طلسم ہمیشہ ہی ناقابلِ بیان رہے گا۔ اصل میں ماحول اتنا شیریں اور شانت تھا کہ مجھے زوروں کی نیند آنے لگی۔ گھونٹو نے میرے گرد ایک فاضل رسّی لپیٹ دی جس سے میں درخت کے تنے کے ساتھ حفاظت سے ٹکا رہوں۔ تب میں نے اپنا سر اُس کے کندھوں پر ٹکا دیا تا کہ میں آرام سے سو سکوں لیکن میرا ایسا کرنے سے پہلے اُس نے مجھے اپنا منصوبہ بتا دیا۔

''میرے وہ پھینکے ہوئے کپڑے وہی ہیں جو میں نے اُن دنوں پہن رکھے تھے جب میرے دل میں خوف نے گھر کر رکھا تھا۔ ان میں ایک عجیب سی بو ہے۔ اگر وہ بھینسا اِن کی بو

سونگھے گا تو ضرور اِدھر آئے گا۔ جو ڈرا ہوا ہوتا ہے وہ ڈر کی باس پر کھنچا چلا آتا ہے۔ اگر وہ میرے خوف سے آلودہ لباس کی تحقیقات کرنے اِدھر آئے گا تو ہم اُس کے ساتھ وہ کارروائی کریں گے جو ہم کرسکیں گے۔ مجھے امید ہے ہم پھندا ڈال کر اُسے ایک پالتو بچھڑے کی طرح لے جاسکیں گے..........'' اِس سے آگے میں اُس کے الفاظ نہیں سُن پایا چونکہ تب تک مجھے نیند آ گئی۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر سو پایا لیکن یکا یک میری آنکھ ایک ڈرامائی ہُنکار سے کھل گئی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو گھونڈ نے جو پہلے ہی جاگ رہا تھا، میرے گرد لپیٹی ہوئی رسّی کھولی اور نیچے اشارہ کیا۔ صبح کاذب کے مدھم اجالے میں پہلے تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا مگر میں نے طیش میں آئے ہوئے کسی جانور کی گرج اور ہنکار واضح طور پر سنی۔ گرم خطے میں دن بہت جلدی نکلتا ہے۔ میں نے نہایت غور سے نیچے کی طرف دیکھا اب دن کی بڑھتی ہوئی روشنی میں میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے دیکھا ـــــ اُس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتی تھیں، ایک چمکتا ہوا (سنگِ موسیٰ کا) سُرمے کا پہاڑ جیسا تھا جو اپنا سیاہ پہلو اس درخت کے ساتھ رگڑ رہا تھا جس پر ہم بیٹھے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی دس فٹ لمبا تھا۔ اگرچہ اُس کا آدھا بدن درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے صبح کی دھوپ میں بھٹی میں سے کالا پتھر نکل رہا ہو۔ میں نے سوچا '' بھینسا جو قدرت کی آغوش میں تندرست اور ریشمی لگتا ہے، چڑیا گھر میں تو ایک خارش زدہ الجھی ایالی والا اور غلیظ چمڑی والا جانور دکھائی دیتا ہے۔ جو لوگ بھینسوں کو چڑیا گھر کی قید میں دیکھتے ہیں کیا کبھی تصور کرسکتے ہیں کہ یہ کتنے خوبصورت ہوسکتے ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ بیشتر کم عمر لوگ جانوروں کو قدرت کی گود میں دیکھنے کے بجائے ـــــ جو چڑیا گھر میں دیکھنے کے مقابلے میں سوگنا مفید ہے ـــــ خدا کی اس مخلوق کے متعلق اپنی واقفیت قید خانوں میں نظر آنے والی ان کی شکل وشباہت سے حاصل کرتے ہیں۔ اگر ہم جیل میں قیدیوں کو دیکھ کر ان میں سے کسی کے اخلاق اور مزاج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتے تو ہم کیسے یہ سوچ کر مطمئن ہوسکتے ہیں کہ ہم ایک جانور کو پنجرے میں ڈال کر اُس کے بارے میں سب کچھ جان گئے ہیں۔

خیر ـــــ اب اُس سفاک بھینسے کا ذکر کی طرف لوٹتے ہیں جو ہمارے درخت کے قدموں میں کھڑا تھا۔ رنگیلا کو میرے کرتے کے نیچے سے نکال کر اُسے درخت پر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ گھونڈ اور میں ااُس پیڑ کی کچھ ٹہنیوں کو سیڑھی کے ڈنڈے بنا کر سطح بہ سطح کچھ نیچے کو اُتر آئے یہاں تک کہ ہم اُس ٹہنی پر پہنچ گئے جو بھینسے سے صرف دو فٹ اوپر تھی۔ اُس نے ہمیں نہیں دیکھا۔ گھونڈ نے پھرتی سے لمبے پھندے کا ایک سرا درخت کے تنے کے گرد باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے بھینسا کبھی کبھی اپنے سینگ اُس پھٹے ہوئے کپڑے میں پھنسا کر کھیل رہا تھا۔ بلاشبہ ان کپڑوں سے آتی ہوئی انسان کی بو اُسے اِدھر کھینچ لائی۔ اگرچہ اُس کے سینگ صاف ستھرے تھے لیکن اُس کے سر پر تازہ خون کے دھبّے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ رات کو گاؤں میں جا کر کسی انسان کو مار کر آیا تھا۔ اُس سے گھونڈ چوکنا ہوگیا۔ اُس نے میرے کان میں سرگوشی کی '' ہم اسے زندہ ہی پکڑیں گے۔ تم اوپر سے یہ پھندا اُس کے سینگوں پر ڈال دو۔ ایک پل میں گھونڈ نے اس ٹہنی سے چھلانگ لگا دی جو بھینسے کے پچھلے حصّے کے قریب تھی۔ اس سے وہ جانور چونکا لیکن وہ پیچھے کو نہیں گھوم سکا کیونکہ اُس کے بالکل قریب ہی وہ دوسرا اجڑ داں پیڑ تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، اور اُس کے بائیں طرف وہ پیڑ تھا جس پر میں کھڑا تھا۔ ان میں سے باہر نکلنے کے لیے اُسے یا تو پیچھے کو ہٹنا تھا یا آگے کو بڑھنا تھا۔ لیکن ایسا ہونے سے پہلے میں نے پھندا اُس کے سر پر ڈال دیا۔ رسّے کے لمس نے اُس پر بجلی کی رو کا سا اثر کیا۔ پھندے سے نکل بھاگنے کے لیے وہ جلدی سے پیچھے ہٹا، اتنی تیزی سے کہ اگر گھونڈ پہلے ہی اگلے پیڑ کے پیچھے نہ چلا گیا ہوتا تو اُس حیوان کے تیکھے سُموں کے نیچے کچلا جاتا اور کٹ مرتا۔ لیکن تب میرے خوف اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ میں اُس کے دونوں سینگوں کو جڑ سے جکڑنے کے بجائے صرف ایک سینگ کے گرد پھندا ڈال پایا تھا۔ اُسی لمحہ میں نے خوف سے چیخ کر گھونڈ کو کہا۔ '' خبردار! اُس کا صرف ایک ہی سینگ جکڑا گیا ہے۔ رسّی کسی بھی وقت اُس کے ایک سینگ سے پھسل سکتی ہے۔ دوڑو دوڑ کر درخت پر چڑھ جاؤ۔''

لیکن اُس نڈر شکاری نے میری ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی بجائے وہ دشمن کے بالمقابل اُس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے اُس وحشی کو اپنے سینگ نیچے جھکاتے اور چھلانگ لگاتے دیکھا۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ جانور اُس رسّی کو کھینچ رہا ہے جس میں اُس کا سینگ جکڑا ہوا تھا اور اُسے اُس درخت کے ساتھ ٹکرانے سے روک رہا تھا جس کے پیچھے گھونٹ کھڑا تھا۔ اُس کی ہیبت ناک ہنکار نے جنگل کو ایک بھیانک غل غپاڑے سے بھر دیا۔ اس ہنکار کی گونج ایک کے بعد ایک یوں مسلسل جاری تھی جیسے ڈرے ہوئے بچے لگاتار چیخیں مارتے ہیں۔

چونکہ بھینسا ابھی تک اُس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ گھونٹ نے اپنا اُسترے جیسا تیز خنجر نکال لیا جو لگ بھگ ڈیڑھ فٹ لمبا تھا اور دو انچ چوڑا۔ وہ آہستہ سے دائیں طرف ایک اور درخت کے پیچھے کھسک گیا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ بھینسا سیدھا اُس مقام کی طرف دوڑا جہاں اُسے اُس نے پچھلی بار دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے پھندے کی رسی ابھی تک اُس کے سینگ سے لپٹی ہوئی تھی۔

یہاں گھونٹ نے اپنے ہتھکنڈے بدل دیے۔ وہ مختلف درختوں کے بیچ سے ٹیڑھا میڑھا مخالف سمت میں بھاگا، ایسا اُس نے اُس مقام تک پہنچنے کے لیے کیا جہاں سے ہوا کے ذریعے اُس کی بو بھینسے تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن حالانکہ بھینسا خوف زدہ تھا پھر بھی پیچھے مڑا اور گھونٹ کے پیچھے بھاگا۔ اُس نے ہمارے پیڑ کے نیچے زمین پر گھونٹ کے کپڑوں کی گٹھری پھر سے دیکھی، اس سے وہ پاگل ہوا تھا۔ اُس نے اُسے سونگھا اور اپنے سینگوں سے روندا۔

اب تک گھونٹ ادھر جا چکا تھا جس سمت کو ہوا چل رہی تھی۔ اگر چہ میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا، لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ اگر بھینسا گھنے درختوں کی وجہ سے نظر سے اوجھل بھی ہو تو گھونٹ اُس کی بو سے جان سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ جب اُس جانور نے گھونٹ کے کپڑوں پر اپنے سینگ گاڑے تو اُس نے پھر ہُنکاری بھری جس سے چاروں طرف درختوں کے درمیان ہل چل سی مچ

گئی۔ پتہ نہیں کہاں سے بندروں کے جھنڈ درختوں کی شاخوں پر دوڑتے ہوئے آ گئے۔ گلہریاں درختوں سے اتر کر چوہوں کی طرح جنگل کے فرش پر بھاگیں اور پھر دوبارہ واپس آئیں۔ پرندوں کے غول جیسے نیل کنٹھ، بگلے اور طوطے اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ اور وہ کوّوں، الوؤں اور چیلوں کے ساتھ مل کر چیخ و پکار مچانے لگے۔ یکا یک بھینسے نے پھر حملہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ گھونٹ خاموشی سے اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اگر میں نے آج تک کسی آدمی کو بے حد خاموش دیکھا ہے تو وہ گھونٹ ہی تھا۔ بھینسے کی پچھلی ٹانگیں جوش سے اُچھل رہی تھیں اور وہ انہیں بار بار جھٹک رہا تھا۔ تب کچھ ہوا۔ وہ پچھلے پاؤں پر ہوا میں اچھلا۔ بے شک یہ پھندے کی رسّی کا تناؤ تھا جس کا ایک سرا ہمارے پیڑ کے تنے سے بندھا ہوا تھا، جس سے وہ زمین سے کئی فٹ اوپر اچھلا اور تب گر پڑا۔ اُسی پل کسی بچے کے ہاتھ سے توڑی گئی کسی سوکھی ٹہنی کی طرح اُس کا سینگ ٹوٹ کر ہوا میں اچھل گیا۔ سینگ کے ٹوٹنے سے ایک زبردست اور ناقابلِ مزاحمت جھٹکا لگا جس نے اُسے پہلو کے بل گرا دیا۔ وہ پچھاڑ کھا کر تقریباً پلٹ گیا۔ اُس کی ٹانگیں ہوا کو ٹھوکر مارتی ہوئی اوپر کو ہو گئیں۔ فوراً گھونٹ ایک چنگاری کی طرح کود کر آگے آیا۔ اُسے دیکھ کر بھینسے نے اپنا توازن بحال کیا اور نتھنوں سے گھر گھراتا ہوا اپنے کولہے کے بل بیٹھ گیا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں لگ بھگ کامیاب ہو چلا تھا لیکن گھونٹ نے اُس کے کندھے پر اپنے خنجر سے وار کر دیا۔ اُس کی مہلک دھار نے گہرا گھاؤ کیا اور گھونٹ نے اپنے پورے وزن کے ساتھ دبا دیا۔ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے جیسی بھینسے کی ہنکار سے سارا جنگل دہل گیا اور اسی کے ساتھ سُرخ لہو کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ مجھ سے یہ منظر زیادہ دیر دیکھا نہیں گیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹوں میں جب میں اپنے اڈّے سے نیچے اُترا تو دیکھا کہ بھینسا رگوں سے خون زیادہ بہہ جانے کے سبب مر چکا تھا۔ وہ خون کے گہرے گڑھے میں پڑا تھا اور گھونٹ اس کے قریب زمین پر بیٹھا ہوا، خون کے دھبّوں کو پونچھ رہا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ چاہتا ہے کہ اُسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میں اُس پرانے درخت کے پاس گیا۔ میں نے رنگیلا کو پکارا لیکن اُس نے کوئی

جواب نہیں دیا۔ میں پھر سے اوپر چڑھا اور درخت کی سب سے اونچی چوٹی تک گیا لیکن بے سود ـــــ وہ وہاں نہیں تھا۔

جب میں نیچے آیا تو گھونڈ خود کو صاف کر چکا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے قدرت کے صفائی مزدوروں کو دیکھا۔ نیچے چیلیں منڈلا رہی تھیں اور ان کے بہت اوپر گدھ۔ ان کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی جانور مر گیا ہے اور انہیں اب جنگل کو صاف کرنا ہے۔

گھونڈ نے کہا کہ ہمیں کبوتر بودھ مٹھ میں مل جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ باقی پرندوں کے ساتھ اڑ گیا ہوگا۔ اس لیے اب ہمیں جلد واپس چلنا چاہیئے۔ لیکن اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہونے سے پہلے میں مُردہ بھینسے کا ماپ لینے چلا گیا، جس پر اب ہر طرف سے مکھیاں آ آ کر بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ ساڑھے دس فٹ لمبا تھا اور اُس کی ٹانگوں کا ماپ تین فٹ سے زیادہ تھا۔

بدھ وہار کی جانب ہماری واپسی کا پیدل سفر خاموشی سے گزرا۔ یہ خاموشی تب ٹوٹی جب دوپہر کے لگ بھگ ہم مصیبت زدہ گاؤں میں پہنچے اور اُس کے مکھیا کو اطلاع دی کہ ان کا دشمن مر چکا ہے۔ یہ سُن کر اُسے راحت ملی اگرچہ وہ بہت دُکھی تھا چونکہ گزشتہ شام کو بھینسے نے اُس کی بزرگ والدہ کو مار ڈالا تھا جو غروب آفتاب سے پہلے پوجا کے لیے گاؤں کے مندر جا رہی تھیں۔

ہمیں زور کی بھوک لگی تھی اور تیزی سے چلتے ہوئے ہم وہار میں پہنچ گئے۔ میں نے فوراً اپنے کبوتر کے متعلق پوچھ تاچھ کی۔ رنگیلا وہاں نہیں تھا۔ یہ خوفناک بات تھی۔ لیکن جب ہم مقدس بزرگ کے حجرے میں گپ شپ میں مصروف تھے تو اُس نے کہا ''گھونڈ! رنگیلا ویسے ہی صحیح سلامت ہے جیسے تم ہو۔'' چند منٹوں کے وقفے کے بعد اُس نے پوچھا ''تمہارے من کی شانتی کو کیا بات کھا رہی ہے؟''

بوڑھے شکاری نے، جو وہ کہنے والا تھا، اس کے بارے میں خاموشی سے کچھ سوچا اور کہا :'' کچھ نہیں سوائے اس بات کے کہ مجھے کسی چیز کو بھی مارنے سے نفرت ہے میں اُس بھینسے کو

زندہ پکڑنا چاہتا تھا لیکن افسوس! مجھے اُس کو ہلاک کرنا پڑا۔ جب اُس کا سینگ ٹوٹ گیا اور اُس کے اور میرے درمیان کچھ بھی نہیں رہا تو مجھے اپنا خنجر اُس کے بدن کی اہم رگ پر ڈالنا پڑا۔ مجھے بہت دُکھ ہے کہ میں اُسے زندہ نہ پکڑ سکا تاکہ اُسے کسی چڑیا گھر کو بیچ سکتا۔''

میں چلّایا ''او کپٹلزم کی روح! مجھے دُکھ نہیں ہے کہ بھینسا مر گیا۔ اپنی باقی زندگی بھر کے لیے پنجرے میں قید رہنے سے تو موت بہتر ہے۔ مُردوں کی طرح جینے سے تو اصل موت قابلِ ترجیح ہے۔

گھونڈ نے جواباً کہا ''کاش تم نے پھندا اُس کے دونوں سینگوں پر ڈالا ہوتا۔''

مقدس لاما بول اٹھا ''تم دونوں کو اب رنگیلا کی فکر کرنی چاہیئے نہ کہ اُس کی جو پہلے ہی مر چکا ہے۔''

گھونڈ نے کہا ''سچ ہے۔ آؤ اُس کی تلاش کرتے ہیں۔''

مقدس لاما نے جواب دیا ''تم دین تام واپس پہنچو میرے بیٹے! تمہارا خاندان تمہارے لیے فکر مند ہے۔ میں اُن کے خیالات سُن رہا ہوں۔''

دوسرے روز ہم دو خچروں پر دین تام کے لیے روانہ ہو گئے۔ لمبے اور جاں گُسل سفر اور الگ الگ پڑاؤ پر دن میں دو بار خچر بدل کر ہم تین دن بعد دین تام پہنچے۔ جب ہم اوپر اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے تو خوشی کے جوش سے بھرا ہوا نوکر راستے میں ملا جس نے بتایا کہ رنگیلا تین روز پہلے واپس آ گیا تھا لیکن چونکہ ہم اُس کے ہمراہ واپس نہیں پہنچے اس لیے میرے والدین فکر مند ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے ہمیں زندہ یا مردہ ڈھونڈ لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔

گھونڈ اور میں لگ بھگ بھاگتے بھاگتے گھر پہنچے اور دس منٹوں میں میں اپنی ماں کی بانہوں میں تھا اور رنگیلا اپنے پاؤں میرے سر پر رکھے اپنا توازن ٹھیک کرنے کے لیے اپنے پنکھ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

یہ میں کیسے بتاؤں کہ میرے دل کو کتنی خوشی ہوئی جب میں نے یہ سُنا کہ رنگیلا پھر سے

اُڑنے لگا ہے۔ وہ بودھ مٹھ سے ہمارے دین تام والے گھر تک پورا راستہ اُڑکر پہنچا تھا۔ وہ نہ تو کہیں ڈگمگایا اور نہ ہی ناکام ہوا۔ ''اے جانِ پرواز! کبوتروں میں انمول موتی!'' میں خوشی میں پکار اٹھا تھا، جب میں نے اور گھونڈ نے گھر کی جانب اپنے قدم تیز کئے تھے۔

اس طرح ہماری سنگالیلا کی تیرتھ یاترا انجام پذیر ہوئی۔ اِس یاترا نے رنگیلا اور گھونڈ دونوں کو ڈر اور نفرت سے نجات دلادی جو وہ میدانِ جنگ سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ بلاشبہ ایسی کوئی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اگر کوئی کسی کو ان بدترین بیماری سے نجات دلادے۔

اس کہانی کے اختتام پر کوئی وعظ دینے کے بجائے میں صرف اتنا کہوں گا:-

''ہم جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اُسی کے رنگ میں ہمارے قول و فعل رنگے ہوتے ہیں۔ جو شخص نادانستہ طور پر بھی خوف زدہ ہوتا ہے یا ذرا سی نفرت سے آلودہ خواب دیکھتا ہے، وہ یقیناً ان دو خصائل کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اس لیے میرے بھائیوں! حوصلہ سے جیو، حوصلے ہی کی سانس لو اور حوصلہ ہی بانٹو۔ پیار سوچو اور پیار محسوس کرو تاکہ تمہاری ذات سے امن وسکون اس طرح چھلکے جیسے فطری طور پر پھول سے خوشبو نکلتی ہے۔''

''سب کو شانتی عطا ہو!''

Printed at Tarang Printers, F-40 Site "C" Surajpur Industrial Area
Greater Noida, U.P